چہار زندانِ انسان

ڈاکٹر علی شریعتی

• ناشر •

ادارہ احیاءِ تراثِ اسلامی کراچی پاکستان

چہار زندان انسان

ڈاکٹر علی شریعتی

ادارۂ احیائے تراثِ اسلامی، کراچی، پاکستان

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب ———— چہار زندان انسان

مصنف ———— ڈاکٹر علی شریعتی

مترجم ———— پروفیسر سردار نقوی

کیلی گرافی ———— جعفری گرافکس فون ۶۸۴۹۲۴

ناشر ———— ادارہ احیاء تراث اسلامی۔ کراچی

طبع ———— چہارم جون سنہ ۱۹۹۳ء

تعداد ———— ایک ہزار

قیمت ———— [redacted] روپیہ

ملنے کا پتہ

احمد بک سیلرز و اسٹیشنرز

اسٹاکسٹ و جنرل آرڈر سپلائرز

۲۰/۱۸ے فیڈرل بی ایریا کراچی ۳۸

فون: ۶۸۴۹۲۴

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱	پیش لفظ: پروفیسر سردار نقوی	۷
۲	موضوع سخن انسان	۱۵
۳	بشر۔انسان	۲۱
۴	انسان اور انسانیت	۲۹
۵	خود آگاہی، انتخاب، تخلیق	۳۱
۶	چہار جبر	۳۳
۷	خود آگاہی انتخاب	۳۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۸	تخلیقی صلاحیت	۴۱
۹	وجودیت	۴۹
۱۰	فلسفہ جبر	۵۳
۱۱	تاریخ جبریت	۵۷
۱۲	عمرانی جبریت	۵۹
۱۳	حیاتیاتی جبر	۶۳
۱۴	چہار زندان	۶۵
۱۵	جبر اور آزادی	۶۹
۱۶	آزادی ۔ مگر کیوں کر؟	۷۱
۱۷	ٹکنالوجی	۷۳
۱۸	تاریخ شناسی	۷۵
۱۹	زندانِ ذات	۸۰
۲۰	علم اور عشق	۸۸

عرض ناشر

ادارہ احیائے تراث اسلامی بارگاہِ رب العزّت میں بے انتہا شکر اور سپاس کے ساتھ اپنے محترم قارئین کی خدمت میں "چہار زندان انسان" کا چوتھا ایڈیشن پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

ڈاکٹر شریعتی کی نئی کتاب "حضر نجات دہندہ کے انتظار میں" شائع ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی آئندہ آنے والی کتب میں "اقبال و ما" اور "ابوذر" شامل ہیں۔

آپ قارئین کی دلچسپی ادارہ کے لیے ایسا حوصلہ ہے کہ وہ اپنی ہر کوشش کو جو آپ کے لیے کی جاتی ہے کم تصور کرتا ہے۔

شہنشاہ جعفری (ایڈووکیٹ)
ناظم ادارہ احیاء تراث اسلامی
یکم جون ۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

پیش لفظ

سردار نقوی

چہار زندان انسان کا موضوع انسان ہے۔

انسانیت کے سامنے سب سے اہم سوال خود انسان کی حقیقت اور ماہئیت ہے، انسان کیا ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر انسانیت کی تمام فکری، علمی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا انحصار ہے، جب تک ہم اس سوال کا درست جواب دریافت نہیں کر سکتے۔ علم و تمدن کی ترقی کے نام پر ہماری تمام کوششیں بے سود اور بے نتیجہ رہیں گی۔ بات یہ ہے کہ جب تک انسان اپنی منزل کا تعین نہ کرے وہ اپنے سفر کے لئے صحیح سمت (DIRECTION) کو متعین نہیں کر سکتا اور جب تک سفر کے لئے صحیح سمت متعین نہ ہو انسان کی فلاح و ترقی کے نام پر کی جانے والی تمام کوششیں اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے کے مترادف قرار پائیں گی اور ان کی کوئی مثبت اور بامعنی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکے گا۔ اکثر اوقات غلط سمت میں سفر انسان کو منزل سے اور دور کر دیتا ہے اور عہد جدید کا انسان خاص طور پر مغربی تمدن اسی صورت حال سے دوچار ہے۔

مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک احیائے علوم یا احیائے انسانیت کی تحریک کہلاتی ہے جس کا مقصد یونانی علوم کے حوالے سے انسانی عظمت کی بازیافت اور علوم جدیدہ کے ذریعہ اس کا اثبات ہے۔ فکر یونان میں انسان دیوتاؤں کا حریف تھا۔ اس لئے مغرب جدید میں انسان کی عظمت کا اثبات خدا کے انکار کے مترادف ٹھہرا۔ لیکن خدا کے انکار کے بعد انسانیت کا کوئی واضح اور معین تصور، آزادی، مساوات، عدل و انصاف اور احترام انسانیت کا کوئی مستحکم فکری، عقلی اور علمی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتی۔ مزید یہ کہ مغربی عیسائیت (واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ کا تعلق مشرق سے تھا اس لحاظ سے ان کا دین مشرقی ہے) نے حضرت عیسیٰ کو انسانیت کے درجے سے بلند کر کے الوہیت کے درجہ پر فائز کر دیا جس کے نتیجہ میں مغرب کے سامنے "انسان کامل" کا کوئی مثالی اور عملی تصور باقی نہیں رہا۔ فطرت پرستی، مادیت پرستی ڈارون کے نظریۂ ارتقاء اور مارکس کی تاریخی جبریت نے صورتحال کو مزید مبہم اور پیچیدہ بنا دیا۔ فطرت پرستی اور مادہ پرستی کے حوالہ سے انسانیت کی جو تعریف و تعبیر کی گئی، بیسویں صدی کے علوم نے اسے ناقص قرار دے کر مسترد کر دیا ہے۔ بیسویں صدی میں علم حیاتیات، علم نفسیات، علم تاریخ اور علم عمرانی نے نئے افقوں کو دریافت کر کے اپنے اپنے تناظر میں انسان کی حقیقت اور ماہیت کی الگ الگ تعریف کی۔ وجودیت نے ایک الگ نقطۂ نظر پیش کیا یوں یہ سوال کہ انسان کیا ہے؟ مختلف تعبیروں کے ہجوم میں گم ہو کر مزید مبہم اور پیچیدہ ہو گیا ہے یعنی صورت حال یہ ہے کہ

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا۔

یہ سوال چونکہ انسان کی تمام علمی اور عملی سرگرمیوں میں ایک مرکز اور محور کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اسلام میں انسان شناسی کو ایک کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ فکر اسلامی میں انسان شناسی کو ایک کلیدی اہمیت حاصل ہے جس کا اندازہ اس قول سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا۔ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ اصل میں تمام دین کی بنیاد خدا اور بندے کا تعلق ہے اور اس تعلق کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کی سب سے پہلی اور بنیادی شرط خدا اور انسان کی معرفت ہے۔ لیکن خدا وہ حقیقت ہے جو لامحدود اور عقل و فہم کی سرحد سے ماوراء ہے اس لئے اس کا ادراک ممکن نہیں ہے اور اس کی معرفت کا کمال اپنے اس عجز کا اعتراف ہے کہ "ماعرفناک حق معرفتک یعنی انسان اس کی معرفت نہیں حاصل کر سکتا جو حق ہے معرفت حاصل کرنے کا۔

اس صورت کا حل کیا ہے؟ اس کا واحد حل یہ ہے کہ انسان خود اپنی معرفت حاصل کرے اپنی حقیقت کو دریافت کرے اور چونکہ انسان اس زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بے پایاں رحم و کرم سے اسے اپنی صفات کا مظہر (اضافی اور مجازی معنوں میں) بنایا ہے اس لیئے انسان کے لیے خود اپنے آپ کو پہچاننا گویا اپنے خالق کی معرفت حاصل کرنا ہے اور جب انسان معرفت نفس کے ذریعہ معرفت رب حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس دنیا کے تناظر میں اپنی زندگی کے صحیح مقصد اور ہدف کو مقرر کر سکتا ہے پھر اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے صحیح راستہ منتخب کر سکتا ہے۔ اور اس راستے پر سفر کرنے کے لئے جس زاد راہ کی ضرورت ہے اسے تلاش کر سکتا ہے اس طرح اس کی تمام علمی اور عملی سرگرمیوں اور اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وحدت اور ہم آہنگی، یک رخی اور یک سوئی قائم ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں

فرد مثالی فرد اور معاشرہ مثالی معاشرہ بن سکتا ہے۔

گویا وہ راستہ جس پر چل کر انسانیت اپنے کمال کو دریافت کر سکتی ہے اور امن، آزادی، انصاف و اخوت اور عدل کا انسانی خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔ اس کی ابتداء معرفت نفس سے ہوتی ہے۔ اور اس کی انتہا معرفت رب ہے چونکہ معرفت رب کی کوئی حد نہیں ہے اور جس قدر انسان اس راہ پر آگے بڑھتا جاتا ہے۔ معرفت کے نئے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ انتہا وہ ہے جس تک پہنچنا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے بلکہ یہ وہ راستہ ہے جو لامحدود ہے اور جس پر سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسانیت کے کمال اور ترقی کا سفر ایک ایسا سفر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ انسان اس راہ پر جس قدر آگے بڑھتا جائے گا ترقی کے نئے امکانات کھلتے جائیں گے۔ اسلام نے انسانیت کے لئے نہ صرف ترقی و کمال کے راستے کی نشاندہی کی ہے بلکہ اسوہ رسول کے ذریعے اس راستہ پر چلنے کے آداب و شرائط کو بھی واضح کر دیا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی انسانیت کے کمال کا مثالی نمونہ ہے۔ وہ ایک آئیڈیل انسان ہیں۔ ان کی شخصیت کمال انسانیت کا مظہر ہے اور ان کی سیرت اس کمال کو حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے۔ انسانیت کی نجات کا واحد راستہ اسی سیرت کا اتباع ہے۔

فکر اسلامی کے اس روشن تناظر میں ڈاکٹر شریعتی نے اس کتاب میں جن مختلف مباحث پر گفتگو کی ہے ان کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی حقیقت، ماہیت، نجات، فلاح، ترقی اور تکامل کی راہ میں حائل رکاوٹیں اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کا طریقہ۔

ان مباحث کے ذیل میں ڈاکٹر علی شریعتی نے جو فکر پیش کی ہے ۔ اس کا ایک نہایت [illegible] خاکہ حسب ذیل ہے:

انسان [illegible] زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے ۔ خلافت ارضی کی عظیم ذمہ داریوں کو [illegible] کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن مخصوص صلاحیتوں سے نوازا ہے ان میں تین صفات نہایت اہم اور نمایاں اور وہ تین صفات یہ ہیں:

(۱) خودآگاہی

(۲) ارادہ آزاد اور انتخاب کرنے کی آزادی ۔

(۳) تخلیق کی صلاحیت ۔

انسانیت کا کمال انہی صفات کے کمال سے عبارت ہے ، جس حد تک انسان ان تینوں صلاحیتوں کو جو اس کے اندر بالقوۃ موجود ہیں بالفعل حقیقت بنا سکتا ہے ۔ اسی قدر وہ انسانی ترقی اور تکامل کی شاہراہ پر آگے بڑھ سکتا ہے ۔ اس ترقی کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ۔ انھیں ڈاکٹر شریعتی "زنداں" سے تعبیر کرتے ہیں ۔ انسان ان زندانوں میں مقید ہے جب تک وہ خود کو ان زندانوں سے رہا نہیں کرا سکتا، وہ صحیح معنوں میں خودآگاہ ، صاحب ارادہ اور فرینندہ نہیں بن سکتا۔

چہار زندان جو انسان کو مقید کئے ہوئے ہیں ان کے نام یہ ہیں ۔

(۱) زندان فطرت

(۲) زندان تاریخ

(۳) زندان جامعہ (معاشرہ) ۔

(۴) زندان ذات

زندان فطرت سے رہائی کا وسیلہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہے ۔

زندان تاریخ سے رہائی کا وسیلہ تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا علم ہے۔
زندان جامعہ سے رہائی کا وسیلہ عمرانیات کا علم ہے۔
گویا پہلے تین زندانوں سے رہائی کا وسیلہ علم ہے یعنی علم فطرت
(سائنس اور ٹیکنالوجی) علم تاریخ اور علم عمرانیات لیکن چوتھے زندان یعنی
زندان ذات سے رہائی علم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ یہ ایثار کی منزل ہے
جس کا محرک عشق ہے۔
آج کے انسان کی صورت یہ ہے کہ وہ علوم کے میدان میں بہت آگے
ہے۔ علم فطرت کے ذریعہ اس نے فطرت کو مسخر کر لیا ہے۔ سائنس او
ٹیکنالوجی کے ذریعہ اس نے فطرت کے خزانوں کو دریافت کر کے بے پنا
قوت، طاقت اور دولت حاصل کر لی ہے، وہ خشکی، تری، فضا اور خلاء
تصرف حاصل کر چکا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ خود کو بھوک اور ننگ کے
خوف سے رہائی نہیں دلا سکا۔ علم تاریخ کے ذریعہ اس نے تاریخ کی قید سے رہا
حاصل کر کے تاریخ کے دھارے کو بدلنے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے ا
علوم عمرانی نے اسے معاشرتی جبر کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ مگر پھر بھی انسا
کی تاریخ دو عظیم اور ہولناک جنگوں اور مسلسل جدل و فساد کی تاریخ ہے جنگ
کا خطرہ اور انسانیت کی تباہی کا خوف تاریخ کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے
اسی طرح جبر جامعہ سے رہائی کے باوجود انسان طبقاتی تضاد اور تصادم
زنجیروں میں گرفتار ہے آزادی اور مساوات، عدل و انصاف اور امن و آشتی
منزل پہلے سے کہیں زیادہ دور ہو گئی ہے۔
وجہ کیا ہے۔؟ ڈاکٹر علی شریعتی کا کہنا ہے کہ انسان اگرچہ فطرت، تا
اور معاشرے کی قید سے رہائی حاصل کر چکا ہے مگر وہ ہنوز اپنے زندان کا ا
ہے وہ ہوا و ہوس کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اپنی خواہشات اور شہوات

غلام ہے۔ اس کے علم نے فطرت، تاریخ اور معاشرہ کی تسخیر کے ذریعہ اسے بے پناہ طاقت عطا کر دی ہے مگر اس کی خواہشات نفس کا دائرہ اس کے گرد مزید تنگ ہوگیا ہے اس وجہ سے ایک زبردست عدم توازن اور تضاد کی صورت پیدا ہوگئی ہے جس نے تمام انسانی تہذیب و تاریخ کو سنگین بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ جس قدر بھوک سے سیری کے اسباب بڑھتے جارہے ہیں انسان کی ہوس کی بھوک میں اور اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اور امن قائم کرنے کے نام پر جس قدر کوششیں تیز ہورہی ہیں۔ جنگ کا خطرہ اسی شدت سے مزید بڑھ رہا ہے۔

ڈاکٹر شریعتی کا کہنا ہے کہ فطرت، تاریخ اور معاشرہ تینوں خارجی زنداں ہیں جن سے رہائی علم کے ذریعہ ممکن ہے مگر زندان ذات داخلی زندان ہے اسے علم کے ذریعہ نہیں توڑا جاسکتا۔ زندان ذات سے رہائی کا مطلب اپنے ہوا و ہوس کی قید سے آزادی ہے۔ اپنی خواہشات پر قابو پانا ہے۔ اپنے نفس کی می سے رہا ہونا ہے یہ تزکیہ و تہذیب نفس کی منزل ہے یہ ایثار و قربانی کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ پر علم کی نہیں عشق کی ضرورت ہے جس کا سرچشمہ ہی تعلیمات ہیں۔

انسان کے انسان بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود کو چاروں زندانوں قید سے آزاد کرائے اور اس کے لئے علم کے ساتھ عشق کی ضرورت ہے۔ ں محض علم یا محض عشق سے کام نہیں چل سکتا۔ علم بغیر عشق محض قت ہے جو ظلم و فسادات کے فروغ کا سبب بنتی ہے اور عشق بغیر علم ضعف کمزوری ہے جو ظلم و فساد کی طاقتوں کی مزاحمت نہ کر کے انھیں مزید طاقتور کا سبب بن جاتی ہے انسانیت کی نجات اور فلاح کا راستہ علم اور عشق امتزاج اور ہم آہنگی کا راستہ ہے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر چل

کر انسانیت اپنے آپ کو دریافت کر سکتی ہے اور اپنے اس کمال کی منزل تک
پہنچ سکتی ہے جس کے امکانات اس کے اندر پوشیدہ ہوں۔

موضوع سخن انسان

ہمارا موضوع گفتگو ہے انسان - اس کی حقیقت اور معنویت -

اصل موضوع پر بات چیت شروع کرنے سے قبل مجھے ایک وضاحت کرنی ہے اور وہ یہ کہ آج کی میری تقریر اصطلاحی طور پر لیکچر نہیں کہی جا سکتی، میرے خیال میں لیکچر سے مراد وہ تقریر ہے جس میں بولنے والا کسی موضوع پر اس نے کسی خاص رخ سے جو تحقیقی مطالعہ کیا ہو اس کا ماحصل بیان کرتا ہے اس کے برعکس مجھے آج جو باتیں عرض کرنی ہیں وہ زیر بحث موضوع پر کسی خاص زاویئے سے تحقیقی مطالعہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ میں اپنے نظریات اور خیالات کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں اور اگر میں استدلال یا تشریح پیش کروں گا تو اس کا مقصد محض اپنے نظریہ کی توضیح ہوگا۔

میں اس سے قبل یہاں تین بار آپ سے خطاب کر چکا ہوں ہوں اور ہر موقع پر میرا موضوع سخن انسان اور اس کی حقیقت سے متعلق رہا اور یہ محض کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ خود انسان ہی ہے۔ اور جتنا زندگی کی ظاہری چمک دمک بڑھ رہی ہے جس قدر انسان فطرت پر اقتدار حاصل کرتا جارہے، جتنی زیادہ آسانیاں اور سہولتیں انسان کو میسر ہوتی جارہی ہیں اسی نسبت سے یہ مسئلہ مشکل تر ہوتا جارہا ہے، اس میں الجھنیں اور ابہام بڑھتا جارہا ہے یہاں تک کہ یہ مسئلہ ایک بہت بڑا اور سنگین مسئلہ بن گیا ہے، انسان اپنے علم کے ذریعہ رموز کائنات کو بے نقاب کرتا جارہا ہے لیکن اس تمام علمی ترقی کے باوجود یہ سوال کہ خود انسان کیا ہے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہے، اور یہ سوالیہ نشان ہر روز اور بڑا ہوتا جارہا ہے، مغربی دنیا ہم سے بہت پہلے اس مسئلہ سے دوچار ہے اور وہاں یہ مسئلہ اس قدر شدت سے محسوس کیا جارہا ہے کہ اس کی بازگشت مشرقی دانشوروں کے افکار میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

اس لحاظ سے آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ سوال ہے کہ انسان کیا ہے۔؟ جب تک ہم اس بنیادی سوال کا کوئی درست معقول اور جامع جواب تلاش نہیں کرینگے اس وقت تک کسی انسانی مسئلہ کے حل کا کوئی امکان نہیں ہے۔

میں نے ایک موقع پر نظام ہائے تعلیم و تربیت کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ آج کی دنیا میں مختلف نظام ہائے تعلیم و تربیت اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں ناکام ہیں اور اس ناکامی کا سبب

یہ نہیں ہے کہ نظام تعلیم میں کوئی خرابی ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ماہرین تعلیم جو ان نظام ہائے تعلیم کو مرتب کرتے ہیں ان کی توجہ تعلیم و تربیت کے طریقوں پر مرکوز رہتی ہے، وہ انسانوں کے لئے تعلیم و تربیت کی تکنیک کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں مگر اس اساسی مسئلہ پر غور نہیں کرتے کہ خود انسان کیا ہے۔

اگر ہم اس بات کو نہیں سمجھتے کہ انسان کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیئے، یعنی اگر انسان کی حقیقت کے بارے میں ہماری فکر واضح اور معین نہیں ہے تو تمدن و ثقافت، تعلیم و تربیت، اخلاق اور معاشرتی روابط کی اصلاح کے نام پر ہماری تمام کوششیں محض بیکار اور بالکل بے نتیجہ ہیں، وہ لوگ جو انسان کی حقیقت کو سمجھے بغیر انفرادی یا اجتماعی اصلاح کا بیڑہ اٹھاتے ہیں ان کی مثال ایک ایسے مالی کی سی ہے جو باغبانی کا فن تو جانتا ہے مگر جن درختوں کی وہ نگہداشت کر رہا ہے انکی انواع سے ناواقف ہے اور یہ بات بھی نہیں سمجھتا کہ اسکے معاشرے میں لوگوں کو کس طرح کے پھلوں کی ضرورت ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی حقیقت اور معنویت کیا ہے؟ جب تک یہ مسئلہ طے نہیں ہوگا تعلیم و تربیت کے میدان میں کسی ترقی کا کوئی امکان نہیں ہے، اسی طرح دنیا کا کوئی اجتماعی نظام، خواہ مارکسزم ہو یا سوشلزم یا اور کوئی آئیڈیالوجی ہو انسانیت کی کوئی بامعنی خدمت نہیں کر سکتا جب تک کے پہلے یہ بات طے نہ کر لی جائے کہ انسان کیا ہے، اس کی زندگی کی غایت اولیٰ کیا ہے وہ کون سا ہدف ہے جس کے تعاقب میں انسان سرگرداں رہتا ہے اس کی فطرت اس سے کس ہدف تک پہنچنے کا تقاضا کرتی ہے گویا اصولاً پہلے یہ طے کرنا ہے کہ اس دور کے اعلیٰ معاشرے، عظیم تمدن اور بظاہر انتہائی ترقی یافتہ

سیاسی اور اجتماعی مکاتیب انسانیت کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں، اس اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر بات سے پہلے جو بات تصفیہ طلب ہے وہ یہ کہ انسان کیا ہے، اس کی حقیقت کیا ہے اور اس حقیقت کو عمل میں ڈھالنے کے لئے بالفاظ دیگر آدمی کو انسان بننے کے لئے کن خطوط پر جدوجہد کرنی چاہیئے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس جگہ صرف سال میں ایک بار آپ سے خطاب کر سکتا ہوں اور یہ موقع بھی کوئی یقینی نہیں ہے نتیجہ یہ ہے کہ میری گفتگو صرف تمہیدی مراحل تک محدود رہتی ہے اس لئے کہ وقت میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہوتی، ہر سال میں ایک گفتگو شروع کرتا ہوں لیکن جب دوسرے سال میں یہاں حاضر ہوتا ہوں تو مجھے سامعین میں گذشتہ سال کے مقابلے میں نئے چہرے نظر آتے ہیں، ہم تمام استادوں کی بدقسمتی یہی ہے کہ ہماری تمام محنت نقش برآب ثابت ہوتی ہے، وہ لوگ جو کسی دفتر کاروبار سے متعلق ہیں اور جو کسی ایک کام میں اگر دس سال مسلسل محنت کرتے ہیں تو ان کے اثرات ان کے اس جگہ سے ہٹنے کے دس سال بعد تک قائم رہتے ہیں اس کے برعکس استادوں کا حال یہ ہے کہ ان کی تمام محنت وقت کا دریا بہالے جاتا ہے،

کسی کالج میں ایک استاد کا اپنے شاگردوں سے زیادہ سے زیادہ تعلق صرف چار سال تک قائم رہتا ہے اور پھر قبل اس کے کہ استاد اپنی محنت کا ثمر دیکھ سکے طالبعلموں کی وہ نسل کالج چھوڑ جاتی ہے اور ان کی جگہ بالکل نئے طالب علم آجاتے ہیں اور پھر استاد کو اپنا کام بالکل نئے سرے سے شروع کرنا پڑتا ہے، معلمی کے پیشے میں یہ بڑی خرابی ہے مگر یہ بات صرف جدید نظام تعلیم و تربیت میں پائی جاتی ہے۔ قدیم نظام تعلیم و تربیت میں صورت حال بالکل مختلف ہے، اس نظام میں ایک طالب علم کو یہ موقع دیا جاتا ہے کہ پہلے وہ مختلف اساتذہ کے درس میں شرکت کرے پھر اپنی پسند اور ذوق کے مطابق وہ کسی ایک استاد کو اپنے لئے منتخب کرلیتا ہے۔ پھر استاد رفتہ رفتہ اس شاگرد کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتا ہے اسے تدریجاً اپنے مکتب فکر سے متعارف کرتا ہے یہاں تک کہ شاگرد اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے جسے تحقیق و کمال کا درجہ کہتے ہیں اس طرح ایک استاد اپنے شاگرد کو اپنے مکتب فکر سے متعلق ابتداء سے انتہاء تک مربوط اور مکمل تعلیم دے سکتا ہے، اس کے برعکس جدید نظام تعلیم میں استاد اور شاگرد کے درمیان اس طرح کا بامعنی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا ہم ایک سال تک ایک کلاس کو پڑھاتے ہیں اور قبل اس کے کہ ہم اپنی محنت کے کسی نتیجہ کی توقع کر سکیں تعلیمی سال ختم ہو جاتا ہے اور جب دوسرا سال شروع ہوتا ہے تو پرانے طالب علموں کی جگہ بالکل نئے طالب علم آجاتے ہیں اور پھر استاد کو نئے سرے سے وہی درس دہرانے ہوتے ہیں اور پھر استاد تمام عمر اسی طرح مختلف نسلوں کو ایک ہی سبق بار بار پڑھاتا رہتا ہے، کلاس روم کے

درو دیوار نہیں بدلتے مگر کلاس روم میں بیٹھنے والے طالب علم ہر سال بدل جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ استاد جن طالب علموں کی تعلیم و تربیت کا کام شروع کرتا ہے وہ ایک قلیل مدت کے بعد اس سے بچھڑ جاتے ہیں اس طرح استاد کا کام نامکمل اور بے نتیجہ رہتا ہے اور اسے اپنی محنت کا ثمر حاصل کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ جدید نظام تعلیم میں یہ بڑا بنیادی سقم ہے۔

(یہ عبارت جو ڈاکٹر شریعتی کی تقریری کے متن میں شامل ہے اس موضوع کے پیش نظر فٹ نوٹ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔)

میری آج کی گفتگو اسی موضوع سے متعلق ہے۔ میں انسان کے موضوع پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ صورت یہ ہے کہ آج کے دور کا انسان اپنی حقیقت سے جس قدر بے گانہ ہے اتنا وہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھا، انیسویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے اس دور تک جس میں ہم گفتگو کر رہے ہیں بیشتر فلاسفر اور مفکرین ادیب اور فنکار انسان کے مسئلہ پر بہت زیادہ توجہ کرتے رہے ہیں اور ہر ایک نے انسان کے بارے میں اپنا ایک الگ نظریہ اور دوسرے سے مختلف تصور پیش کیا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کی حقیقت آج کے دور میں ہر دور سے زیادہ متنازعہ حقیقت بن گئی ہے۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

انسان کے بارے میں میری فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسان جبر کے چار حصاروں میں محصور ہے۔ وہ چار زندانوں میں مقید ہے اور اور انسان حقیقی معنوں میں انسان نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ جبر کے ان چار حصاروں کو نہ توڑے اور ان زندانوں کی قید سے خود کو آزاد نہ کر لے۔

اس اعتبار سے بنیادی سوال یہ ہے کہ یہ چار زندان یا جبر کے چار حصار کیا ہیں اور انسان ان سے خود کو کس طرح آزاد کرا سکتا ہے؟

لیکن اس سے بھی پہلے یہ دیکھنا ہے کہ ہم جب انسان، کہتے ہیں تو

اس سے ہمارا مقصود کیا ہے، انسان کی ایک تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ انسان چار زندانوں کا قیدی ہے، اور مجھے انسان کی اسی مخصوص تعریف کے حوالے سے گفتگو کرنی ہے۔ اور اس گفتگو میں اس بات کی وضاحت کرنی ہے کہ وہ چار زندان کیا ہیں اور ان سے رہائی کے لئے کون سا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

بشر: انسان

قرآن حکیم میں انسان کے لئے دو مختلف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ایک بشر اور دوسرے انسان۔ جہاں جہاں کلام پاک میں لفظ بشر استعمال ہوا ہے اس سے مراد انسان بحیثیت نوع ہے، چار پایوں کے برعکس بشر دو ٹانگوں والے حیوان کی وہ نوع ہے جو سلسلۂ موجودات کے نکتۂ کمال پر ظاہر ہوئی اور اس وقت سے اب تک روئے زمین پر موجود ہے، لیکن جس جگہ قرآن انسان کا لفظ استعمال کرتا ہے اس سے مراد محض ایک نوع حیوان نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد انسان کی وہ بلند اور منفرد حقیقت ہے جو ایسی صفات سے متصف ہے کہ جو صفات اور خصوصیات کسی دوسرے مخلوق میں نہیں پائی جاتیں پس انسان کے وجود کی دو سطحیں ہیں، ایک سطح تو وہ ہے جس کا تعلق علم حیاتیات سے ہے اور جو طبیب اور فزیالوجسٹ کا موضوع فکر و عمل ہے، اور انسان کی دوسری سطح وہ ہے جس کے بارے میں شاعر شعر کہتا ہے۔ فلسفی فکر کرتا ہے اور جس سے مذہب سروکار رکھتا ہے۔

بہ اعتبار نوع انسان اپنی جسمانی ساخت، اعضاء کی بناوٹ اور نفسیاتی لحاظ سے کچھ خصوصیت کا حامل ہے یہ خصوصیات اس نوع کے ہر فرد میں پائی جاتی ہیں خواہ وہ سیاہ ہو یا سفید شرقی ہو یا غربی، مذہبی ہو یا غیر مذہبی، انسان کی یہی نوع خصوصیات ہیں کہ جن کی بنیاد پر حیاتیات، نفسیات اور طب کے

علوم ظہور میں آئے ہیں، ان علوم کی روشنی میں ہم انسان کی جسمانی ساخت کی توضیح و تشریح کر سکتے ہیں، اس کی جسمانی بیماریوں کے اسباب اور ان کے لئے علاج کے طریقے دریافت کر سکتے ہیں اور اس کا نفسیاتی تجزیہ اور مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا تعلق انسانی وجود کی اس سطح سے ہے جو بشریت کی سطح ہے۔

لیکن انسانی وجود کی دوسری سطح اس بلند حقیقت سے عبارت ہے جو ان مشترک جسمانی اور نفسیاتی خصوصیات سے ماوراء ہے، یہ انسان کی وہ خصوصیات ہیں جو تمام افراد میں یکساں طور پر نہیں پائی جاتیں بلکہ جو فرد جس حد تک ان خصوصیات کو خود میں اجاگر کر سکتا ہے وہ اسی حد تک خود کو انسان بنا سکتا ہے۔

اس لئے جب ہم انسان کہتے ہیں تو اس سے ہمارا مقصد انسان کی وہ تعریف نہیں ہے جو بہ اعتبار نوع کی جاتی ہے، ایک اندازے کے مطابق زمین پر نوع انسانی کی آبادی تین ارب ہے، نوع انسانی کے تمام افراد میں جسمانی بناوٹ اور ساخت کے اعتبار سے کچھ مشترک خصوصیات کے اعتبار سے یہ سب ایک نوع ہیں، مگر یہ انسان کی وہ سطح ہے جسے قرآن بشر کہتا ہے، انسانوں کی تمام آبادی بشر ہے مگر تمام بشر انسان نہیں ہیں اس لئے کہ انسان ہونے کے لئے جسمانی خصوصیات کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے اور اگرچہ کہ جسمانی خصوصیات کے اعتبار سے نوع انسانی کے تمام افراد ایک جیسے ہیں۔ مگر جہاں تک انسانی خصوصیات کا تعلق ہے یہ ہر فرد میں مختلف درجے پر پائی جاتی ہیں، بشر کی سطح پر ہر فرد دوسرے فرد کا مثل ہے مگر انسان کی سطح پر ہر فرد دوسرے فرد سے مختلف ہے، انسان کی سطح تک پہنچنے یا انسان بننے

کے لئے ہر فرد کو خود جدوجہد کرنا ہوتی ہے اور ہر فرد اپنی سعی و کوشش کے اندازے کی نسبت سے انسانیت کے پست یا بلند درجہ پر فائز ہوتا ہے، گویا نبی آدمؑ کی ترقی اور تکمیل کا سفر بشریت سے انسانیت کی طرف ترقی کا سفر ہے۔

بشر وجود کی وہ سطح ہے جو موجود ہے (BEING) اور انسان وجود کی وہ سطح ہے جو مقصود ہے (BECOMING) ہر فرد بحیثیت بشر موجود ہے لیکن ہر فرد کو خود کو انسان بنانے کے لئے جدوجہد کرنا ہوتی ہے، انسان بننا ہر فرد کی ذمہ داری ہے، انسان اور بشر میں فرق یہ ہے کہ بشر کے وجود کی سطح حیوانات نباتات اور جمادات کے وجود کی سطح کے مماثل ہے جبکہ کائنات کی تمام دیگر موجودات کے برعکس انسان کو اپنی انسانیت کی تعمیر خود کرنا ہوتی ہے، میں اس بات کی وضاحت ایک مثال سے پیش کرتا ہوں۔ چیونٹیاں جس طرح اپنے گھر آج بناتی ہیں اسی طرح وہ ہمیشہ سے بناتی آرہی ہیں، آج سے ۱۵ ملین سال قبل افریقہ میں ان کے گھروں کے جو آثار ملے ہیں وہ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے گھر وہ آج تعمیر کرتی ہیں، اسی طرح ان کی زندگی گذارنے کا طریقہ بھی وہی ہے جو ہمیشہ سے تھا، گویا وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ کوئی چیز تبدیل نہیں ہوتی ہر چیز اپنی جگہ جامد اور ساکن ہے زمانی اور مکانی تغیرات وجود کی سطح پر اثر انداز نہیں ہوتے، چیونٹیوں کی نوع کا ہر فرد خواہ کسی جگہ ہو کسی زمانے میں ہو اس کی زندگی کے طور طریقوں میں کوئی معمولی سا فرق بھی نظر نہیں آتا۔ یہ وجود کی سطح ہے جو جامد ثابت اور ناقابل تغیر ہے، کائنات کی تمام موجودات میں وجود کی ہی سطح پائی جاتی ہے، پہاڑ، ستارہ، پانی، جانور، کھوڑا، شیر، پرندہ سب وجود کی اسی سطح پر موجود ہیں یہی صورت بشر کے ساتھ ہے اس کے وجود کی سطح بھی جامد اور غیر متحرک ہے، وہ ایک ایسا حیوان ہے جو دو ٹانگوں پر چلتا ہے بشر کی

یہ تعریف اس نوع کے ہر فرد پر منطبق ہوتی ہے خواہ وہ وقت کے کسی دور میں ہو، زمین کے کسی خطہ میں ہو بشر بہر حال بشر ہے اور اس کی نوعی خصوصیات یکساں اور ناقابل تغیر ہیں۔

سائنسی رسالوں میں بڑی حیرت انگیز اور دلچسپ کہانیاں بھی چھپی ہیں ایسی ہی ایک کہانی بشر کے متعلق میں نے پڑھی تھی۔ یہ کہانی زمین پر رہنے والے ایک مفکر اور سائنسداں کے سفر مریخ کی سرگذشت کے طور پر لکھی گئی تھی، ہوا یوں کہ ہمارا خلانورد کسی طرح مریخ پر پہنچ گیا۔ اور پیدل مریخ کے گلی کوچوں کی سیر کے لئے نکل کھڑا ہوا آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل کے دور میں جدید سیاح (ٹورسٹ) اپنے تھیلے پیٹھ پر لاد کر گلی کوچوں میں پیدل آوارہ گردی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا زمینی سیاح مریخ کی سیر میں مصروف تھا کہ اس نے کسی کالج کے باہر ایک پوسٹر آویزاں دیکھا جس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ مریخ کے ایک عظیم محقق اپنے تازہ ترین زمینی سفر کے تاثرات اور زمین پر جو موجودات ہونے والی مخلوق کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان فرمائیں گے۔ ہمارا زمینی سائنسداں بھی اس کانفرنس میں شریک ہوگیا اب آپ اس سے کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال سنئے۔

ہمارے زمینی سائنسداں کا کہنا ہے کہ کرہ مریخ کے سائنسدان نے اپنی گفتگو کے آغاز میں یہ اعلان کیا کہ ہمارے سائنسدانوں کا یہ دعویٰ کہ زمین پر جاندار مخلوق پائی جاتی ہے بالآخر صحیح ثابت ہوا، بے شک زمین پر حیات کا سلسلہ موجود ہے اور ہماری تحقیقات نے یہ بھی نشاندہی کی ہے کہ زمین پر جو موجودات پائے جاتے ہیں انمیں بعض انواع حیات کی انتہائی ترقی کے درجہ تک پہنچ چکی ہیں ان میں سے ایک نوع کا نام بشر ہے۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ کے سامنے اس نوع کی صحیح تصویر کشی کر سکوں آپ کے ذہن

میں چونکہ اس قسم کی کسی مخلوق کا تصور نہیں ہے اس لئے میں اس کی مکمل تصویر پیش کرنے سے خود کو معذور پاتا ہوں۔ جسمانی ساخت کے ساتھ ہی میں نے ان کی خصوصیات کا مشاہدہ کیا، اس عجیب مخلوق میں جو بشر کہلاتی ہے کچھ ایسی وحشیانہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جنکو بیان کرنے کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، یہ روئے زمین پر ایک جگہ سے دوسری جگہ بہت تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور ان کے اندر ایک دوسرے کو قتل کرنے کی خواہش جنون کی حد تک پائی جاتی ہے، بارہا میں نے دیکھا کہ ان کی کثیر فوج ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہے، یہ جدید اور خوفناک اسلحہ سے مسلح لشکر جن کے افراد ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے اور نہ ان کے درمیان کوئی باہمی رنجش پائی جاتی ہے مگر اس کے باوجود یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے کے جنون ن میں مبتلا نظر آتے ہیں، یہ گھروں کو اجاڑتے ہیں، بستیوں کو ویران کرتے ہیں اور نہایت سفاکی اور بے دردی سے ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ پہلے پہل تو مجھے یہ خیال ہوا کہ شاید یہ ایک دوسرے کا گوشت کھاتے ہوں اور ایک دوسرے کو اپنی غذائی ضرورت کی تکمیل کی غرض سے قتل کرتے ہوں، مگر میں نے دیکھا کہ کشت و خون کا بازار گرم کرنے کے بعد کسی نے کسی لاش کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ نہ وہ ان کا گوشت کھاتے ہیں، نہ خون پیتے ہیں۔ بلکہ میدان جنگ میں لاشوں کے انبار چھوڑ کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انکا جنون قتل و غارت گری پھر انہیں میدان میں کھینچ لاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ نوع بشر کی تمام تاریخ خود کشی اور خود آزاری کی تاریخ ہے ان کی تمام ایجادات کا مقصد ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ خوفناک اسلحہ بنانا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے درمیان کوئی

ذاتی عداوت نہیں ہوتی یہ محض خون بہانے کے لئے خون بہاتے ہیں، گویا فتنہ و فساد اور خونریزی ان کی سرشت میں داخل ہے اور یہ اپنی جبلت خونریزی کو تسکین دینے کے لئے ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں جب میدان جنگ میں ایک لشکر دوسرے لشکر کے مقابل ہوتا ہے تو ان کی بہیمیت ناقابل بیان ہوتی ہے، جب ایک لشکر دوسرے پر غالب آجاتا ہے تو فاتح لشکر مفتوحہ علاقوں میں قتل عام کرتا ہے، بستیوں اور گھروں کو تخت و تاراج کر دیتا ہے اور اس وحشتناک عمل میں انہیں عجیب لذت محسوس ہوتی ہے پھر فاتح لشکر اپنی فتح کا جشن مناتا ہے اور اس قدر غرور مباہات کا اظہار کرتا ہے جس کا بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں نوع بشر کے افراد ایک دوسرے کا گوشت نہیں کھاتے، ان کے خوراک حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ روئے زمین پر جہاں سے گذرتے ہیں ان کے جسم میں جو دو بالائی ہینڈل لگے ہوئے ہوتے ہیں ان کے ذریعہ ہر چیز کو نوچ لیتے ہیں، ان کے اس عمل میں حرص شدید کا انداز پایا جاتا ہے، زمین سے جو چیزیں اگتی ہیں وہ نہایت لطیف اور پاکیزہ ہوتی ہیں ان میں نہایت خوش مزہ اور خوشبودار میوے اور بہت عمدہ پھل اور پھول شامل ہیں، مگر یہ قدرت کی عطا کردہ ان نعمتوں کو قدرتی حالت میں استعمال نہیں کرتے بلکہ یہ گوشت سبزیاں اور پھل اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں وہاں انھیں کچھ برتنوں میں ڈال کر چولھے پر چڑھا دیا جاتا ہے پھر ان میں کچھ بدبودار اور مضر صحت اشیاء کی آمیزش کر کے ان کو پکایا جاتا ہے اس طرح جب یہ غذا تیار ہو جاتی ہے تو اسے بے تحاشہ کھاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے علم اور تیکنیک کے ذریعہ ان کے شکم کو ان غذاؤں سے خالی کر دے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر ان کے معاشرہ میں نہایت اہم

مقام رکھتے ہیں ۔ خلاصہ یہ کہ ایک طرف تو یہ لوگ نہایت ترقی یافتہ ہیں اور انھوں نے فطرت کو مسخر کر لیا ہے ۔ مگر دوسری طرف یہ ایسے پیچیدہ مسائل اور بیماریوں کا شکار ہیں جن سے اور کوئی مخلوق دوچار نہیں ہے ۔

مرتخ کے سائنس دان نے بشر کی جو تعریف کی ہے وہ اگرچہ کسی حد تک مبالغہ آمیز اور مضحکہ خیز نظر آتی ہے لیکن اگر آپ نگاہ بصیرت سے دیکھیں تو آپ کو یہ باتیں بالکل مطابق واقعہ نظر آئیں گی ، اگر ہم تاریخ بشر کا مطالعہ کریں تو ہم یہ محسوس کریں گے کہ یہ تاریخ ، تاریخ شعور سے زیادہ تاریخ جہالت و حماقت ہے ، تاریخ کے ہر دور میں بشر علم و شعور سے زیادہ جہل و حماقت کا نمونہ نظر آتا ہے ۔ اور آج بھی اسکی یہی حالت ہے ، بشر کی فطرت ہمیشہ یکساں رہی اور آج بھی اس میں کوئی تغیر نہیں ہوا ، روئے زمین پر بشر کی فطرت جامد اور غیر متغیر نظر آتی ہے اس میں کسی طرح کا کوئی فرق واقع نہیں ہوا ، اسلحہ ، لباس اور خوراک کی نوعیت بدلتی رہی مگر بشر کی خصوصیات نہیں بدلیں ۔ وہ جیسی پہلے دن تھیں ویسی ہی آج بھی ہیں ۔

چنگیز جس نے وحشی اور بدوی قوم پر حکومت کی یا دور ماضی کے وہ سلاطین جو بڑی بڑی اور مہذب سلطنتوں پر قابض رہے ۔ ان میں اور آج کے دور کے انتہائی ترقی یافتہ اقتصادی اور سیاسی نظاموں کی قیادت میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ ان حکمرانوں اور آج کے دور کے حاکموں میں کوئی فرق اگر ہے تو وہ محض اتنا کہ دور سابق کے حکمران اور آمر اپنے ظلم و تشدد کو چھپاتے نہیں تھے ، انھوں نے آج کے متمدن نظاموں سے دروغ گوئی کی تربیت حاصل نہیں کی تھی ، وہ صاف اور صریح لفظوں میں اس بات کا اعلان کر دیتے تھے کہ ہماری کسی ملک پر چڑھائی کا مقصد وہاں کے لوگوں کا قتل عام کرنا ہے ، اس کے برعکس آج کے متمدن انسان کام وہی کرتے ہیں مگر وہ اپنی خونریزی کو قیام

امن کی کوششوں کا نام دیتے ہیں حالانکہ ان کے یہ دعویٰ دروغ محض ہیں، جھوٹ اور فریب ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ وہ نوع بشر کو کمال اور ترقی کی طرف لے جارہے ہیں مگر ان کی طبیعت میں نفاق، جھوٹ آدم کشی اور دوسروں کو قتل کرنے کی ہوس اسی طرح ہے جیسے دور گذشتہ میں تھی بلکہ دوسروں کے قتل و غارت سے وہ ماضی کی نسبت زیادہ لذت اندوز ہوتے ہیں، ان معنوں میں انسان ایک غیر متغیر اور جامد وجود ہے مگر یہ انسانی وجود کی وہ سطح ہے جسے بشر کہنا چاہیئے۔

انسان اور انسانیت

انسان کا جوہر وہ بلند حقیقت ہے جسے انسانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے، بشریت انسانی وجود کی طبعی سطح ہے اور انسانیت اس کی معنوی سطح ہے۔ بشر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی معنویت کو تلاش کرے، بشر کی جدوجہد انسان بننے کی جدوجہد ہے اور یہ جدوجہد ان خصوصیات کی تلاش سے عبارت ہے جنہیں آئیڈیل کہا جاتا ہے اور آئیڈیل خصوصیات طبعی خصوصیات کی طرح موجود نہیں ہوتیں بلکہ ان کو حاصل کرنے کے لئے طویل اور مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسان، بشر کی طرح حقیقت موجود نہیں ہے بلکہ حقیقت مقصود ہے، بشر کا مقصد انسان بننا ہے لیکن انسان بننے کے عمل کی کوئی حد معین نہیں کی جاسکتی۔ انسان بننے کا عمل ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے اس لئے کہ انسانی کمالات کے امکانات لامحدود ہیں۔

قران حکیم کی آیت انا للہ وانا الیہ راجعون انسان شناسی کا فلسفہ ہے الیہ راجعون کا مطلب یہ ہے کہ انسان مسلسل اپنے رب کی طرف رجوع کر رہا ہے الیہ کے معنی ہیں اللہ کی طرف اور یہ لفظ میری فکر کو اجاگر کرنے میں

کلیدی حیثیت رکھتا ہے، میں اہل تصوف کے اس نظریہ سے متفق نہیں ہوں کہ انسان خدا تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اس لئے کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کا مطلب خدا کو ایک نکتۂ ثابت تصور کرنا ہے یعنی کوئی ایسا نکتہ جس تک پہنچ کر انسان کا سفر ارتقاء رک جاتا ہے۔ الیہ کے معنی ہیں خدا کی طرف یہ انسان کے سفر کی سمت ہے اور اس سفر کی کوئی منزل نہیں ہے اس لئے کہ خدا کوئی نکتہ ثابت نہیں ہے اس کے لئے کوئی جگہ اور کوئی حد معین نہیں کی جا سکتی خدا وہ ابدی اور مطلق حقیقت ہے جو لامحدود ہے جس تک رسائی ممکن نہیں ہے مگر جس کی طرف انسان کو رجوع کرنا ہے اس لئے اللہ کی طرف انسان کا سفر مسلسل جاری رہنے والا سفر ہے، یہ ایک ایسی منزل کمال کی طرف سفر ہے جس تک رسائی ممکن نہیں ہے، انسان اس راہ میں جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے اس کے درجۂ کمال میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر وہ کمال مطلق تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا یہی وجہ ہے کہ اس کا سفر کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر انسان بننے کا عمل طلب کمال کا ایک ایسا عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے، جس میں کوئی جائے توقف نہیں ہے، گویا انسان بننے کے معنی اپنے کمالات میں ترقی کی مسلسل اور کبھی نہ ختم ہونے والی جدوجہد ہے۔

خود آگاہی: انتخاب: تخلیق

اس سطح بلند سے جب آپ انسان کو دیکھیں یعنی جب آپ انسان کی اس سطح وجود کو نظر میں رکھیں جو خود سازی اور تعمیر انسانیت کی سطح ہے تو پھر آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو سکے گی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین ایسی نمایاں اور بنیادی خصوصیات سے نوازا ہے جو اسے کائنات کی دیگر مخلوقات سے ممیز اور ممتاز بناتی ہیں اور وہ تین خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ خود آگاہی۔

۲۔ آزاد ارادہ اور انتخاب کی صلاحیت

۳۔ صلاحیت تخلیق۔

انسان کی تمام دیگر صلاحیتیں انہی تین بنیادی صلاحیتوں کی شاخیں ہیں، خود آگاہی انسان کو صحیح اور آزادانہ انتخاب کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ اور خود آگاہی اور ارادہ آزاد کی بدولت انسان ان چیزوں کو خلق کر سکتا ہے جو فطرت میں موجود نہیں ہیں۔

یہی وہ تین صفات اور خصوصیات ہیں جو انسانیت کو ناپنے کا پیمانہ ہیں جس شخص میں جس قدر خود آگاہی ہوگی، جس قدر صلاحیت انتخاب ہوگی اور جس حد تک تخلیقی صلاحیت ہوگی وہ اسی حد تک خدا کو انسان بنا سکتا ہے۔

جس وقت انسان کی یہ صلاحیتیں جو اس میں بالقوت موجود ہیں بالفعل صلاحیتوں میں ڈھلتی ہیں اس وقت انسان کی حقیقت روشن ہوتی ہے اور جس حد تک یہ صلاحیتیں عملی طور پر ظاہر ہوتی ہیں اسی حد تک انسان خود کو انسان بناتا ہے۔

انسان بننے کی راہ میں کچھ رکاوٹیں ہیں جن کو دور کئے بغیر کسی فرد کے لئے اس راہ میں سفر کرنا ممکن نہیں ہے، لیکن ان رکاوٹوں کو دور کرنے کیلئے ضروری ہے کے ان کی شناخت کی جائے، جس وقت انسان خود کو انسان بنانے کی راہ میں قدم رکھتا ہے تو وہ ان رکاوٹوں کو پہچان لیتا ہے اور جب وہ ان موانعات کو شناخت کر لیتا ہے تو پھر اس کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ راستہ کی ان رکاوٹوں کو دور کر کے ترقی اور کمال کی اس راہ پر گامزن ہو سکے جو تعمیر انسانیت کی راہ ہے۔

چہار جبر

چار قوتیں ایسی ہیں جو انسان کے انسان بننے یعنی اس کی خود آگاہی، انتخاب اور صلاحیت تخلیق کی راہ میں حائل ہیں، یہ وہ زنجیریں ہیں جو انسان کو قید کئے ہوئے ہیں، ان زنجیروں سے آزاد ہوئے بغیر انسان کے لئے انسان بننا ممکن نہیں ہے، لیکن اس بات کو ذرا وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس مقصد کے لئے ہمیں انسان کی حقیقت پر غور کرنا ہوگا۔

ڈیکارٹ (DESCARTES) کا یہ جملہ بہت مشہور ہے کہ "میں فکر کرتا ہوں اس لئے میں ہوں" ڈیکارٹ نے اپنی خود آگاہی کی بنیاد فکر کو بنایا ہے لیکن اس کے اس مشہور مقولہ میں اس کی تشکیک بول رہی ہے۔ دراصل ڈیکارٹ ہر بات میں شک کرنے کا عادی ہے پہلے وہ اپنے وجود میں شک کرتا ہے پھر وہ یہ استدلال کرتا ہے کہ میں اس بات میں شک نہیں کر سکتا کہ میں شک کر رہا ہوں اور چونکہ میں شک کر رہا ہوں اس لئے میں ہوں۔ یہ پس منظر ہے ڈیکارٹ کے اس مشہور مقولہ کا کہ "میں فکر کرتا ہوں اس لئے میں ہوں" ڈیکارٹ کے تمام نظریات کی بنیاد اسی مقولہ پر ہے۔

انسان کی ایک دوسری تعریف آندرے زید(ANORE GIDE) سے منسوب ہے وہ کہتا ہے کہ "میں احساس کرتا ہوں اس لئے میں ہوں۔"

تیسری تعریف البرٹ کامو(ALBERT CAMUS) کی ہے جو زیادہ بامعنی اور درست ہے، اس کا کہنا ہے کہ "میں بغاوت کر رہا ہوں اس لئے میں ہوں"

انسانی وجود کی یہ تین تعریفیں ہیں جو اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔

(۱) وہ کہ فکر کر رہا ہے وہ ہے جب تو فکر کر رہا ہے۔

(۲) وہ کہ محسوس کر سکتا ہے وہ ہے جب تو محسوس کر سکتا ہے۔

(۳) وہ کہ بغاوت کر رہا ہے وہ ہے جب تو بغاوت کر سکتا ہے۔

ان تینوں میں آخری قول یعنی بغاوت کر رہا ہوں اسلئے میں ہوں، انسانی وجود کی سب سے بہتر تعریف ہے اس لئے کہ اس میں انسان کے ہونے اور بننے دونوں جہات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

جب تک آدمی بہشت میں تھا اور اس نے خوئے بغاوت کا اظہار نہیں کیا تھا اس کی انسانی خصوصیت ظاہر نہیں ہوئی تھی وہ اس وقت تک انسان نہیں تھا، فرشتہ تھا، مگر انسان نے عقل و دانش کا پھل کھا کر اپنی انسانیت کا اثبات کیا، خود آگہی، شعور اور ارادہ آزاد کی صلاحیتیں جو اس میں پوشیدہ تھیں اب اس پر ظاہر ہو گئیں اس کے نتیجہ میں اسے اس بہشت سے نکال دیا گیا جہاں اسے بغیر کسی سعی و کوشش کے ہر چیز میسر ہو جاتی تھی (وہ بہشت جس سے انسان کو نکالا گیا اس بہشت سے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے کیفیت کے اعتبار سے مختلف ہے)

زمین پر انسان کی زندگی سعی و کوشش، جد و جہد، مبارزہ اور کشمکش سے

عبارت ہے، جس طرح ایک بچہ والدین کی نگہداشت کے حصار سے نکل کر آزادی کی منزل میں قدم رکھتا ہے اسی طرح انسان جنت سے نکالے جانے کے بعد جب اس زمین پر آیا تو یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب انسان نے آزادی کی منزل میں قدم رکھا ہے، اب وہ خود اپنی ہستی کا ذمہ دار ہے، اب اس کے تمام معاملات خود اسی سے متعلق ہیں، اب وہ ہر طرح آزاد اور خود مختار ہے۔

دنیاوی زندگی میں اپنے آپ کو بنانے یا بگاڑنے کی ذمہ داری خود انسان پر عائد ہوتی ہے، دیگر مخلوقات جبلت کے تحت زندگی گذارتے ہیں، غرایز حیوانی ان کی زندگی کو ایک مخصوص روش پر ڈھال دیتے ہیں وہ اپنی زندگی کی نہج کا انتخاب خود نہیں کرتے بلکہ وہ ایک مقرر نہج پر زندگی گذارنے کے لئے مجبور ہیں۔

اس کے برعکس انسان وہ مخلوق ہے جس میں خود آگاہی کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنا راستہ خود منتخب کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی آزادی کا اظہار کرنے کے لئے تمام پابندیوں کے خلاف بغاوت کرتا ہے، جنت میں انسان کا رویہ اس کی آزادی کا اظہار اور غلامی سے بغاوت کا اعلان تھا یہ انسان ہی ہے جو غلامی سے آزادی کا اظہار اور غلامی سے بغاوت کا اعلان تھا یہ انسان ہی ہے جو غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بغاوت کر سکتا ہے اور یہ بھی انسان ہی کی صفت ہے کہ وہ خود اپنے لئے اطاعت اور عبادت کا راستہ منتخب کر کے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اگر انسان بغاوت نہیں کر سکتا یعنی اگر انسان اپنی زندگی کا راستہ منتخب کرنے کے لئے آزاد نہیں ہے تو پھر اسکی عبادت ان جانوروں کی اطاعت طرح ہے جو خود آگاہی اور آزادی سے محروم ہیں، انسان سے ایسی اطاعت ب نہیں ہے جسکی بنیاد جبر پر ہو بلکہ منصب انسانیت کا تقاضا وہ اطاعت ور عبادہ ہے جسے انسان اپنی آزادی کے ذریعہ خود منتخب کرے۔ گویا تمام دیگر

مخلوقات کی اطاعت جبر ہے جبکہ انسان کی شان یہ ہے کہ اس کی عبادت وہ جبر ہے جس کی بنیاد اختیار پر ہے۔ بالفاظ دیگر یہ جبر اختیاری ہے۔

تمام موجودات میں فقط اور فقط انسان ہی وہ ہستی ہے جو انتخاب کرنے کی قدرت اور صلاحیت رکھتی ہے؟ انسان کی خوئے بغاوت اس بات کی علامت ہے کہ وہ انتخاب کی قدرت رکھتا ہے۔ البرٹ کاموکا یہ کہنا کہ میں بغاوت کر رہا ہوں اس لئے میں ہوں اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان اپنے فطری ماحول اور سماجی حالات کے خلاف بغاوت کر سکتا ہے۔ وضع موجود کی نفی کر کے اسکو بدل سکتا ہے یعنی ایک حالت کی جگہ دوسری حالت کا انتخاب کر سکتا ہے اور یہی وہ بات ہے جس سے انسان کی انسانیت عبارت ہے، اس کے برعکس ڈیکارٹ کا یہ قول کہ میں فکر کر رہا ہوں اس لئے میں ہو انسان کے وجود کا اثبات تو کرتا ہے لیکن اس کی انسانیت کے اثبات کے لئے کوئی ٹھوس بنیاد فراہم نہیں کرتا۔

خودآگاہی: انتخاب

انسان موجود خود آگاہ ہے ، تمام کائنات میں صرف انسان کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ وہ خودآگاہی کی منزل تک پہنچ سکا ہے۔

خودآگاہی تین باتوں سے عبارت ہے۔ خود اپنی کیفیت اور سرشت کا ادراک کائنات کی دیگر موجودات کی حقیقت کا علم اور اس کائنات سے اپنے تعلق کی نوعیت اور کیفیت کا شعور۔

جس حد تک بشر ان تین بنیادی باتوں کے متعلق آگاہی حاصل کرتا جاتا ہے اسی حد تک انسان بنتا جاتا ہے۔

خودآگاہی انسان کی پہلی صفت ہے اور دوسری صفت یہ ہے کہ انسان انتخاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یعنی تمام موجودات میں فقط انسان اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ فطرت کے خلاف، سماجی حالات کے خلاف، حتّٰی کہ اپنی جسمانی اور نفسیاتی ضرورتوں اور اپنے طبعی اور جبلی تقاضوں کے ف بغاوت کر سکے۔ انسان اس چیز کا انتخاب کر سکتا ہے جس کے لئے نہ اسے

فطرت مجبور کرتی ہے اور نہ اس کے جسمانی تقاضے اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔
یہ انسان کی انسانیت کا بلند ترین مرحلہ ہے۔

ہر جبر اور دباو سے آزاد ہو کر انتخاب کرنے کی صفت خاص الوہی صفت ہے جس کا پرتو انسان میں پایا جاتا ہے، دیگر حیوانات کی صورت یہ ہے کہ ان کے جسمانی اور جبلی تقاضے ان کی زندگی کی نہج کو مقرر کرتے ہیں اور وہ ان تقاضوں کو رد کرنے یا ان کے برعکس انتخاب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، بھیڑوں میں ہر سال ایک مخصوص فصل میں جنسی ہیجان پیدا ہوتا ہے بھیڑیں اس بات پر قدرت نہیں رکھتیں کہ وہ اس جنسی ہیجان کو ابھرنے سے روک سکیں اور جس وقت یہ کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔ ان کے لئے جنسی جذبے کی تسکین کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا مگر جب اس ہیجان کو موسم گذر جاتا ہے تو پھر وہ مسئلہ جنس کو یکسر بھول جاتی ہیں، کسی جذبہ کا ابھرنا، اس کی تسکین پر مجبور ہونا اور پھر اس کے متعلق ہر بات بھول جانا یہی تمام جانوروں کی خصوصیت ہے۔

مگر جہاں تک انسان کا تعلق ہے انسان نہ صرف علم فطرت کے جبر کو انکار کرتا ہے بلکہ خود اپنی جبلت اور فطرت کے تقاضوں کے خلاف بغاوت کی صلاحیت بھی رکھتا ہے، وہ تحفظ ذات کی جبلت کو رد کر کے خود کشی کر سکتا ہے وہ اپنی انانیت کے تقاضوں کو رد کر کے ایثار و قربانی کے شعار کو اپنا سکتا ہے، وہ دوسروں کی خاطر کسی نظریہ کی خاطر اپنی جان قربان کر سکتا ہے اس کے فطری تقاضے اسے زندگی کے ایسے راستے کی طرف کھینچتے ہیں جو آرام آسائش کا راستہ ہے۔ لیکن انسان اس راستہ کو ترک کر کے بغاوت و انقلاب راستہ اختیار کر سکتا ہے جس میں آرام و آسائش کی جگہ سختی، کشمکش اور

جدوجہد سے سابقہ پڑتا ہے وہ لباس اور خوراک کے پیچھے سرگرداں رہنے کی بجائے زہد اور پارسائی کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ انسان ہی وہ تنہا مخلوق ہے جو فطرت، سماج، ماحول، جبلت غرض ہر طرح کے خارجی اور داخلی جبر اور تقاضوں کو رد کر کے آزادانہ طور پر انتخاب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

تخلیقی صلاحیت

انسان کی تیسری اہم اور امتیازی خصوصیت اس کی تخلیقی صلاحیت ہے جس کا اظہار دو صورتوں میں ہوتا ہے ۔ صنعت و حرفت کی صورت میں اور ہنر و فن کی شکل میں انسان کی صلاحیت تخلیق کا دائرہ معمولی چیزوں سے لیکر صنعت و حرفت کے عظیم نمونوں اور نادر فنی شہ پاروں تک پھیلا ہوا ہے، انسان اس کائنات میں اپنے خالق کی قدرت تخلیق کا مظہر ہے ، صرف اور صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جس میں تخلیقی جوہر پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات انسان کی تعریف یوں بھی کی جاتی ہے کہ انسان اوزار ساز حیوان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کی صناعی اور سازندگی کی حد صرف اوزار سازی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے ماوراء انسان جہان دیگر کی تخلیق بھی کر سکتا ہے۔

انسان کی صلاحیت تخلیق کا محرک یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنے جسمانی قویٰ اور فطری ماحول پر قناعت نہیں کر سکتا، جب انسان زندگی کے ارتقائی مدارج طے کرتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ فطری طور پر اسے جو قویٰ عطا کئے گئے ہیں وہ اس کی احتیاجات کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں بجائے خود یہ احساس کہ فطرت اس کی احتیاجات کو کماحقہ، پورا کرنے سے قاصر ہے اس بات کی علامت ہے کہ انسان کے اندر انسانیت بیدار ہو رہی ہے جب تک انسان کے لئے اس کے جسمانی قویٰ کافی رہتے ہیں اس کی مثال اس جانور کی سی ہوتی ہے جو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے قدرت کے مہیا کئے ہوئے اسباب و وسائل پر تکیہ کرتا ہے، اس کے برعکس جب انسان کی احتیاجات اس حد پر پہنچ جاتی ہے کہ ان کے پورا کرنے کے لئے فطری قویٰ ناکافی محسوس ہوتے ہیں تو پھر سعی و تلاش و جستجو کی منزل شروع ہوتی ہے، یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اب انسان ترقی اور تکمیل کے اس مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے جب فطری اسباب و وسائل اس کے لئے ناکافی ہیں بالفاظ دیگر انسان کی سطح اب فطرت کی سطح سے بلند ہے، اپنے کمال کا یہی احساس ہے جو بقول ہائیڈگر انسان کے احساس تنہائی کی بنیاد ہے، احساس تنہائی کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود کو اس مادی عالم کا ایک حصہ سمجھنے کی بجائے اس سے مختلف اور ممتاز حیثیت میں دیکھتا ہے اور جب انسان اس سطح سے خود کو دیکھتا ہے تو اسے خود میں اور عالم فطرت میں یگانگت کی بجائے مغائرت نظر آتی ہے، وہ احساس بیگانگی سے دوچار ہوتا ہے، وہ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ فطری ساخت کے اعتبار سے اس کی نوع دیگر حیوانات کی انواع سے مختلف ہے، وہ ان امور کی طرف کشش محسوس کرتا ہے جن کو پورا کرنا محض جسمانی قویٰ کے سہارے ممکن نہیں ہے لہذا وہ ایجادات کی طرف توجہ کرتا ہے تاکہ فطری طور پر اسے جو کچھ

حاصل نہیں ہے اس کمی کی تلافی ان ایجادات کے ذریعہ کر سکے، مثلاً انسان چاہتا ہے کہ وہ فطری رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے ہوا میں پرواز کر سکے مگر قدرت نے اسے اڑنے کیلئے پر عطا نہیں کئے، اس کمی کی تلافی وہ اس طرح کرتا ہے کہ اڑنے والے جہاز ایجاد کر لیتا ہے۔ سمندروں کو عبور کرنے کے لئے کشتیاں بناتا ہے وہ معمولی چیزوں سے لے کر انتہای پیچیدہ اور ترقی یافتہ مشینوں تک ایجاد کرنے پر قادر ہے، جیسے جیسے وہ ارتقائی سفر طے کرتا ہے اس کی احتیاجات بڑھتی جاتی ہیں اور وہ ان احتیاجات کی تکمیل کے لئے صنعتوں کو ایجاد کرتا جاتا ہے۔

صنعت انسانی تخلیق کی وہ جہت ہے جس کے ذریعہ وہ عالم فطرت کو مسخر کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق اپنے مفاد میں استعمال کر سکتا ہے، مثلاً پٹرولیم ایک قدرتی دولت ہے لیکن یہ دولت اس وقت تک حاصل نہیں کی جا سکتی جب تک سنگلاخ چٹانوں کو توڑنے والی مشینیں ایجاد نہ کی جائیں۔ انسان اپنے جسمانی قویٰ کے بل پر اس قدرتی دولت سے استفادہ نہیں کر سکتا اور نہ وہ بغیر ٹیکنالوجی کے پٹرولیم سے حاصل ہونے والی دیگر مصنوعات کو حاصل کر سکتا ہے یہی وہ صورت حال ہے جو انسان کو مشینوں کی ایجاد اور صنعتی تخلیق کے لے آمادہ بلکہ مجبور کرتی ہے۔

انسانی صلاحیت تخلیق کی دوسری جہت خلقت ہنری ہے جو خلقت صنعتی سے بالکل مختلف ہے، اور خلقت ہنری کو دیکھتے ہوئے انسان کی یہ یعنی خلاقیت سے عبارت ہے۔

اس تمہید کے بعد اب ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہمارا موضوع گفتگو جو تعریف کہ وہ اوزار ساز حیوان ہے مزید ناقص نظر آتی ہے، ہنر اور فن کی تخلیق نسبتاً بلند تر سطح پر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کی صلاحیت تخلیق

اللہ کی قدرت تخلیق کا پرتو ہے انسان کی خلاقیت دو سطحوں پر ظاہر ہوتی ہے، صنعت کی سطح پر اور ہنر اور فن کی سطح پر، صنعت کی سطح پر خلاقیت کا مقصد تسخیر فطرت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیزیں جو فطرت میں موجود ہیں اور جن سے استفادہ بغیر ٹیکنالوجی کے ممکن نہیں ہے، انسان مشینوں کی ایجاد کے ذریعہ ان موجود وسائل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے، مگر ہنر کی سطح پر تخلیق کا مطلب ان چیزوں کی تخلیق کرنا ہے جنکی انسان تمنا کرتا ہے مگر جو فطرت میں موجود نہیں ہیں، اس اعتبار سے فنی تخلیق صنعتی تخلیق کی سطح سے ماوراء اور بلند ہے جس کے ذریعہ انسان ایک جہان دیگر کی تخلیق کرتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا سے جیسی کہ وہ ہے مطمئن نہیں ہے لہذا وہ اپنے فن اور ہنر کے ذریعے ایک ایسی دنیا کو تخلیق کرتا ہے جو موجود نہیں ہے، وہ اپنی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق ایک ایسی دنیا کا خاکہ پیش کرتا ہے جو اس کی موجود دنیا سے زیادہ حسین اور متوازن ہے۔ مختصر یہ ہے کہ صنعتی تخلیق کا مقصد ان وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے جو فطرت میں موجود ہیں ٹیکنالوجی کو ایجاد کرنا ہے جبکہ ہنر اور فن کی سطح پر تخلیق کا مقصد اس دنیا کو خلق کرنا ہے جو موجود نہیں ہے مگر جسکی انسان آرزو کرتا ہے، اس اعتبار سے ٹیکنالوجی اور ہنر انسان کی وہ خصوصیت ہے جو اس کی انسانیت کی تیسری جہت انسان ہے اسکی تعریف یہ ہے کہ وہ سہ بعدی موجود ہے، اسے تین ایسی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں جو محض اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور وہ تین صلاحیتیں یہ ہیں۔

۱۔ آگاہی۔ خود اپنے متعلق، اس کائنات کے متعلق، اور اپنے اور اس کائنات کے روابط کے متعلق

۲۔ آزادی اور انتخاب

۳۔ صلاحیت تخلیق۔ صنعت کی سطح پر اور ہنر کی سطح پر

ایک جملہ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان وہ موجود ہے جو خود آگاہ ہے آزاد ہے اور تخلیق کار ہے۔

مگر یہ تینوں صفات خاص الوہی صفات ہیں جن کا پرتو انسان میں پایا جاتا ہے، لیکن بندہ کی صفات کو اللہ کی صفات پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کی صفات مطلق ہیں انسان مجازی اور محدود معنوں میں ان صفات کا حامل ہے لیکن یہ انسان کا بہت بڑا شرف اور امتیاز ہے کہ کائنات کی تمام موجودات میں صرف اسے ان صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ انسان میں یہ صلاحیتیں بالقوہ پائی جاتی ہیں وہ اپنے سعی و عمل سے ان صلاحیتوں کی تربیت کر سکتا ہے، انہیں ترقی دے سکتا ہے اور ان کی پرورش اور نگہداشت کے ذریعہ انہیں سرحد کمال تک پہنچا سکتا ہے۔

تخلقوا باخلاق اللہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان خود کو صفات الہیٰ کا مظہر بنائے (تا حد امکان) اس لئے کہ انسان کو زمین پر اللہ کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ بات انسان پر صادق آتی ہے نہ کہ بشر پر، انسان اگر بشر کی سطح پر ہے تو وہ الہیٰ صفات کا مظہر نہیں بن سکتا، وہ دیگر حیوانات کی طرح فطری اور جبلی تقاضوں کے تابع رہتا ہے، جب بشریت انسانیت کی حد تک ترقی کر لیتی ہے تو پھر انسان خلافت الہیٰ کا اہل بنتا ہے، یہ انسان ہے جو فطرت کے تقاضوں کو رد کر کے آزادانہ انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے، جس کا ارادہ، ارادہ آزاد ہے، جو خود آگاہ ہے اور جو تخلیقی صلاحیت رکھتا ہے، یہ تینوں صفات اللہ تعالیٰ میں مطلق معنوں میں پائی جاتی ہیں اور انسان اضافی اور محدود معنوں میں ان صفات کا حامل ہے۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے، تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ وہ انسان جو تین

عظیم الوہی صفات یعنی خودآگاہی انتخاب اور خلاقیت کا مظہر ہے خود کو چار ایسے زندانوں میں مقید پاتا ہے جو اس کی ان صفات کی ترقی اور تکمیل کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور جب تک انسان خود کو ان زندانوں سے آزاد نہ کرلے وہ اپنی صلاحیتوں کو ترقی دینے، بالفاظ دیگر خود کو انسان بنانے سے معذور رہے گا، آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ تمام نظریات جو انسان کی انفرادی ضرورتوں کی تکمیل اور اس کی اجتماعی ترقی کے لئے کوشاں ہیں خود انسان کی حقیقت کو صحیح تناظر میں دیکھنے سے معذور نظر آتے ہیں اور اسطرح بالواسطہ ان عوامل کو تقویت پہنچاتے ہیں جو انسان کے انسان بننے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ جدید دور میں قدیم نظریات و عقائد کی غلط توجیہ کرکے انسان کے مسئلہ کو مزید الجھایا جارہا ہے، مجھے اپنے فرانس کے قیام کے دوران ایک لیکچر میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس لیکچر کے مقرر کا نام عبدالقادر مالک ہے، ان صاحب کا سلسلہ نسب الجزائر کے معروف مجاہد عبدالقادر سے ملتا ہے (مجھے افسوس ہے کہ ایک ایسے حقیر شخص کا سلسلہ ایک ایسے عظیم انسان سے ملتا ہے) یہ صاحب پیرس کے ایک کالج میں خطاب کر رہے تھے اور ان کی گفتگو اسلام میں انسان کی تحقیر اور ذلت کے موضوع پر تھی ان کا دعویٰ یہ تھا کہ مکتب اسلامی میں انسان کی حیثیت حقیر، ذلیل اور زوال پذیر ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ مشیت اور قضا پر اعتقاد اسلامی عقیدہ میں ایک لازمی شرط ہے۔ اور اسلامی عقیدے کے مطابق انسان کی نجات صرف اللہ کی اطاعت کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اپنی کوئی عظمت یا حیثیت نہیں ہے۔ میں نے اس تقریر کو سن کر عرض کیا کہ مقرر نے اسلام میں انسان کی تحقیر و تذلیل کے متعلق جو استدلال قائم کیا ہے وہ ان کی

کج فکری اور غلط بینی کا نتیجہ ہے - ان کا یہ کہنا ہے کہ مشیت پر اعتقاد، قضا و قدر پر اعتقاد اور اس بات پر اعتقاد کہ انسان کی نجات کا راستہ اللہ کی عبادت اور اطاعت ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام انسان کو ایک حقیر اور بتذل مخلوق سمجھتا ہے - دراصل خود ان کی فکر کے ابتذال اور انحطاط کی دلیل ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو انسان کو خدا کا جانشین اس کا نائب اور خلیفہ اور اضافی اور مجازی طور پر اللہ کی صفات کا مظہر سمجھتا ہے - اور انسان کو خود آگاہ، انتخاب کنندہ اور آفرینندہ جہاں ہونے کی دعوت دیتا ہے - اب اہل نظر خود انصاف کر سکتے ہیں کہ اسلام انسان کی حیثیت کو گھٹاتا ہے یا اسے عظمت و بلندی کے اس مقام کی طرف دعوت دیتا ہے کہ جس کی مثال پیش کرنے سے دور جدید کی فکر بھی قاصر ہے - جدید دور کے نظریات انسانی عظمت کے دعویدار ہونے کے باوجود اس بلندی تک نہیں پہنچ سکتے جس بلندی تک اسلام انسان کو لے جاتا ہے -

مادیت کا مکتب فکر (MATERIALISM) انسان کی جنس اور ذات کو صرف و محض مادہ کی ظہور آرائی سمجھتا ہے - اور اس اعتبار سے انسانی عظمت، ترقی اور تکامل کے تمام امکانات محض مادیت کے حصار میں محدود رہیں - اگر انسان، فقط اور صرف جنس مادہ کی سطح سے بلند ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتا اس مکتب فکر میں روحانی ترقی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے - یہاں مابعد الطبیعیات کی سطح سرے سے موجود ہی نہیں اس لئے انسان کے اس سطح تک بلند ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے - بالفاظ دیگر اس مکتب فکر میں انسان کی تمام ترقی اور تکامل کا دائرہ صرف مادی ابعاد اور اشکال تک محدود

دوسرا مکتب فکر جو انسان کی حیثیت کو گھٹانے اور اسے پست کرنے کا داعی ہے وہ فطرت پرستی (NATURALISM) ہے - اس مکتب فکر کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا - اور اسے انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں بڑی مقبولیت اور ترقی حاصل ہوئی -

اس مکتب فکر کا دعویٰ ہے کہ تمام موجودات کی اصل اور حقیقت فطرت ہے جو زندگی تو رکھتی ہے مگر خود آگاہی نہیں رکھتی - تمام موجودات اسی زندہ مگر ناخود آگاہ فطرت کی پیداوار ہیں - اور انسان بھی دیگر موجودات کی طرح فطرت ہی کا ساختہ اور پرداختہ ہے - اس لئے انسان وہی کچھ ہے جیسا کہ فطرت نے اسے بنایا ہے - انسان کی ساخت کا سانچہ فطرت بناتی ہے - اس اعتبار سے انسان اگر خود کو آزاد محسوس کرتا ہے - اگر اس میں انتخاب کرنے اور تخلیق کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے تو یہ آزادی، یہ انتخاب اور آفرینیدگی کی صلاحیت اس طور سے پائی جاتی ہے اور اس حد تک پائی جاتی ہے جس طور اور جس حد تک فطرت نے اسے یہ صلاحیتیں عطا کی ہیں - انسان کی فہم اس کی صلاحیت، انتخاب اور قدرت تخلیق فطرت کی عطا کردہ اور اس اعتبار سے محدود اور ناقص ہے - اور انسان فطرت کی مقرر کی ہوئی حدود سے بلند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا - بالفاظ دیگر انسان بھی کائنات کی دیگر تمام مخلوقات کی طرح فطرت کی پیدا کردہ مخلوق ہے - فرق صرف یہ ہے کہ انسان دیگر مخلوقات کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ اور کامل تر ہے -

وجودیت

وجودیت کا معاملہ نسبتاً مختلف اور ایک حد تک دلچسپ بلکہ تعجب انگیز ہے وجودیت کے علمبرداروں میں دو مختلف گروہ ہیں یک وہ جو خدا کا قائل ہے جیسے کیر کے گارد(KAIR GARD) اور دوسرے وہ جو خدا کے وجود کے منکر ہیں ۔ جیسے ہایہ گر(HOIDEGGER) اور سارتر(SATER) لیکن حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ سارتر جیسے منکر خدا وجودیت پسند بھی اس بات کے دعویدار ہیں کہ انسان اپنی نوع اور جنس کے اعتبار سے فطرت کی دوسری مخلوقات سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ متضاد ہے ۔ سارتر مابعد الطبیعیات کا قائل نہیں ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس بات کا قائل ہے کہ انسان وہ موجود ہے جو فطرت کا تابع نہیں بلکہ جو فطرت پر تصرف اور اقتدار رکھتا ہے اور یہ کہ انسان دوسری موجودات سے مختلف بلکہ متضاد ہے اور اس تضاد کی صورت بقول سارتر یہ ہے کہ فطرت کی تمام دیگر مخلوقات میں ماہیت کو وجود پر تقدم حاصل ہے جبکہ انسان میں وجود کو ماہیت پر تقدم حاصل ہے مگر سارتر ایسا کیوں کہتے ہیں خود انہی کے لفظوں میں اس کا جواب یہ ہے کہ خدا

کے انکار کی وجہ سے ہم اس بات پر مجبور ہیں کہ ہم انسان کے وجود اور ماہئیت کی تعبیر اور توجیہہ مادیت اور فطرت کے حوالے سے کریں نتیجہ یہ کہ انسان اور اس کی انسانیت کو مادیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے ۔ ناچار انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دیگر اشیاء کے برعکس جن میں ماہیت وجود پر مقدم ہے ۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس میں وجود پہلے ہے ، ماہیت بعد میں اور یہ کہ انسان اپنی تقدیر (ماہیت) کو خود بناتا ہے ۔

اس بات کی توضیح یوں کی جاسکتی ہے کہ جس وقت کوئی شخص کرسی بناتا ہے تو کرسی کا وجود پہلے ظاہر نہیں ہوتا ۔ آپ کسی بڑھئی سے پوچھیں تم کیا بنانا چاہتے ہو، وہ جواب دے گا کرسی ۔ آپ پوچھیں گے کہ کرسی کیا چیز ہے ؟ وہ وضاحت کرے گا کہ کرسی ایک ایسی شے ہے کے جس کے چار پائے ہوتے ہیں ۔ ایک پشت گاہ ہوتی ہے اسے لکڑی سے بنایا جاتا ہے اور یہ کہ جو کرسی وہ بنانے والا ہے اسی میں کس قسم کی لکڑی استعمال کریگا ۔ اور اس کا رنگ کیا ہوگا ۔ جس وقت بڑھی کرسی کے متعلق یہ تفصیلات بیان کرتا ہے تو گویا وہ اس کی ماہیت سے آپ کو متعارف کراتا ہے حالانکہ کرسی ابھی وجود میں نہیں آئی ہے مگر بڑھئی کے ذہن میں اس کی ماہیت پوری طرح واضح ہے اور وہ اس ماہیت کے مطابق کرسی کو بناتا ہے صاف لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک کرسی کا تعلق ہے بنانے والے کے ذہن میں کرسی کی ماہیت اس وقت بھی موجود ہے جبکہ کرسی خود موجود نہیں ہے ۔۔ اور اسی ماہیت کے مطابق وہ کرسی کو وجود عطا کرتا ہے ۔

مگر انسان کی صورت اس کے برعکس ہے یہاں وجود پہلے ہے اور یہ انسان جو موجود ہے اس کی ماہیت کے متعلق ابھی کچھ معلوم نہیں ہے ہر وہ

انسان جو وجود رکھتا ہے اس کی حقیقت اور ماہئیت بعد میں معین ہوگی اور ہر شخص اپنی ماہئیت کو خود معین کرے گا۔ اپنی تقدیر کو خود بنائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دیگر موجودات کے برعکس کہ جن کے متعلق یہ پہلے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیا ہیں اور پھر ان کا وجود اسی ماہئیت کے مطابق ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انسان کی حقیقت اور ماہئیت نامعلوم ہے۔ انسان پہلے وجود میں آتا ہے پھر اپنے ارادے کے ذریعہ اپنے وجود کو ماہئیت عطا کرتا ہے اور ہر شخص اس بارے میں آزاد ہے کہ وہ اپنے وجود کو کس طرح کی ماہئیت اور معنویت عطا کرے۔ وہ اپنی حقیقت کو خود منتخب کرتا ہے اور اپنے انتخاب کے مطابق اپنے وجود کو ماہئیت عطا کرے۔ وہ اپنی حقیقت کو خود منتخب کرتا ہے اور اپنے انتخاب کے مطابق اپنے وجود کو ماہئیت عطا کرتا ہے اس لئے سارتر کہتے ہیں کہ اگر انسان سے اس کے ارادے اور انتخاب کی صلاحیت کو چھین لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان سے اس کی انسانیت کو چھین لیا اور اس طرح انسانیت کی تمام عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔

سارتر اس بارے میں متفکر ہیں اور ان کی یہ فکر اور پریشانی درست ہے کہ اگر ہم مادہ پرستی یا فطرت پرستی کے دیئے ہوئے انسان کے تصور کو قبول کر لیں جیسا کہ آجکل عموماً کیا جارہا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم انسان کی حقیقت کو بڑی حد تک محدود اور جامد کر دیتے ہیں۔ یہ انداز فکر انسانی ترقی اور تکامل کے دائرہ کو محدود کرتا ہے۔ جو بجائے خود انسانی عظمت اور حقیقت کو گھٹانے کے مترادف ہے۔

فلسفہ جبر

وحدت الوجود کا نظریہ بھی انسان کی عظمت کی نفی کرتا ہے باوجودیکہ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کی اساس خدا پرستی کے تصور پر رکھی گئی ہے۔ وحدت وجود یا جبر الہیٰ کا تصور جس کے اسلام میں بھی بعض فرقے قائل ہیں وہ نظریہ ہے جو ہندو فلسفہ تصوف اور عیسائیت کے کیتھولک فرقے میں پایا جاتا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا خالق ہے اور وہ ہر شئے کو خلق کرنے سے پہلے اس کی تقدیر معین کرنے والا ہے۔ اس متکب فکر میں اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو اس انداز سے اہمیت دی جاتی ہے جس سے انسان کے ارادہ اور اختیار کی نفی لازم ہو جاتی ہے۔ جبریہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر شئے کی ماہئیت، اس کی حقیقت اس کا ارادہ سب کچھ ارادہ الہیٰ کے اسطرح تابع ہے کہ اس سے

سرمو انحراف ممکن نہیں ہے۔ ہر انسان کی تقدیر اس کی تقدیر سے پہلے معین ہو جاتی ہے اور یہ نوشتہ اس کی پیشانی پر لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جب انسان اس دنیا میں آتا ہے تو اس کے لئے اس نوشتۂ تقدیر سے انحراف ممکن نہیں ہو سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان وہی کچھ بننے پر مجبور ہے جو پہلے سے اس کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے۔ حافظ کا یہ شعر اسی انداز فکر کی غمازی کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

چو قسمت ازلی ہے بے حضور ما کردند
گراند کی نہ بہ وفق رضا است خرد ہیگر

یعنی انسان سے یہ نہیں پوچھا گیا کہ اسے کون سی بات پسند ہے اور کیا پسند نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جیسا چاہا بنا دیا اور اس کی تقدیر اس طرح معین کی گئی کہ اس میں انسان کے ارادہ اور انتخاب کا کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان جو دنیا میں اپنی زندگی گذارتا ہے وہ اسی پہلے سے طے شدہ نوشتہ تقدیر کے مطابق ہوتی ہے انسان اس نوشتہ تقدیر کو بدلنے کی قدرت و اختیار نہیں رکھتا۔ ایک دوسرے شاعر نے اس شعر میں کچھ ترمیم کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر اس فلسفہ کو درست مان لیا جائے کہ انسان کو کوئی ارادہ یا اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ وہ مجبور محض ہے تو پھر اس شعر میں "اند کی" کی بجائے "ہمہ اش" کہنا درست تر ہوگا یعنی بجائے اس کے کہ یہ کہیں کہ

گراند کی نہ بہ وفق رضا است خوردہ مگیر

یوں کہنا چاہیئے کہ

ہمہ اش گر نہ بہ وفق رضا است خوردہ مگیر

کیوں؟ اس لئے کہ یہ فلسفہ جبر ہے۔ انسان مجبور ہے پھر اگر سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف ہے تو بھی اسے اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہے آخر جبر

کے مقابلے میں آپ کیا کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اعتراض بھی نہیں کر سکتے۔

جو لوگ فلسفہ جبر کے قائل ہیں ان کا کسی بات پر معترض ہونا اسی طرح غلط ہے جیسے البرت کامو کا یہ کہنا کہ "میں اعتراض کرتا ہو" میں کہتا ہوں تم (کامو) کس پر اعتراض کر رہے ہو۔ کیا خدا پر؟ لیکن جو شخص خدا پر اعتراض کرتا ہے اس کے لئے پہلے خدا کو تسلیم کرنا ضروری ہے تو پھر کیا تم خدا کو مانتے ہو۔ جواب ملے گا نہیں (ہم خدا کو نہیں تسلیم کرتے)

تو پھر تم کس پر اعتراض کر رہے ہو کس کے خلاف بغاوت کر رہے ہو۔ کیا فطرت کے خلاف مگر فطرت تو بے شعور ہے، خود آگہی سے محروم ہے پھر تمہاری بغاوت کا اس پر کیا اثر ہوگا۔ تمہارا فطرت پر معترض ہونا محض کار فضول ہے۔ اس کے قوانین تو اندھے ہیں اس پر تمہارے اعتراض یا بغاوت کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

یہی صورت حال جبریہ کے ساتھ ہے۔ جہاں مسئولیت نہیں ہے وہاں کسی اعتراض کا کیا جواز ہے تم کہ اس مسئولیت کا انکار کرتے ہو تو پھر تم کس بنیاد پر اعتراض کرتے ہو، یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی ہوا سے لڑ رہا ہو۔

اگر مشیت الہٰی کا یہ مطلب ہے کہ اس سے انسان کے اپنے ارادہ اور انتخاب کی مکمل طور پر نفی ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان مسئول نہیں ہے اور جو انسان مسئول نہیں ہے وہ در حقیقت انسان ہی نہیں ہے۔

جبر مشیت کا عقیدہ قرون وسطیٰ میں بہت مقبول تھا۔ قرون وسطیٰ کی عیسائیت اس عقیدہ کی مبلغ تھی بعد میں مشیت کے جبر کی جگہ مادیت یا خطرت کے جبر نے لے لی، انیسویں صدی مادیت پرستی کی صدی ہے اور اٹھارہویں صدی میں فطرت پرستی کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں یہ کہا جاتا تھا کہ انسان جبر مشیت کے آگے مجبور ہے۔ انسان وہی کچھ بن

سکتا ہے جو اس کے لئے خدا نے مقدر کر دیا ہے - اس میں انسان کے اپنے ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے، انیسویں صدی میں بھی یہی بات کہی جاتی تھی (کہ انسان مجبور ہے) مگر اب جبر کا سرچشمہ خدا کے بدلے مادے یا فطرت کو تسلیم کر لیا گیا اور چونکہ خدا کے مقابلہ میں مادہ اور فطرت کی حیثیت پست ہے - اس لئے جب ان عوامل کے اعتبار سے انسان کو مجبور تسلیم کیا جاتا ہے تو اس سے انسان کی حیثیت اور زیادہ پست اور مبتذل ہو جاتی ہے -

بیسویں صدی میں بھی جبر کا یہ تصور باقی ہے لیکن اب مادیت یا فطرت پرستی کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے جس طرح ہم اٹھارہویں صدی کو فطرت پرستی اور انیسویں صدی کو مادیت پرستی سے منسوب کرتے ہیں اس طرح ہم بیسویں صدی کو کسی ایک مخصوص مکتب فکر سے نسبت نہیں دے سکتے - اس کے برعکس اس صدی میں تین نئے فکری مکاتیب ظہور میں آئے اور یہ تینوں مکاتیب فکر انسان کی خود آگاہی اور اس کے آزاد ارادے اور انتخاب کی صلاحیت کی نفی کرتے ہیں ان میں سب سے جدید تر نظریہ حیاتیات کے جبر (BIOLOGICISM) کا نظریہ ہے اس سے قبل دو اور نظریات ہمارے سامنے آئے جن میں سے ایک عمرانی جبریت (SOCIOLOGICISM) کا نظریہ ہے اور دوسرا تاریخی جبریت (HISTORICISM) کا نظریہ ہے -

تاریخی جبریت

اس مکتب فکر میں انسانی شخصیت تاریخی جبریت کے حوالے سے پہچانی جاتی ہے یہ تاریخی عوامل ہیں جو انسان کی ماہئیت اور حقیقت کو معین کرتے ہیں ۔ تاریخی حالات جیسا سانچہ بناتے ہیں انسان کی شخصیت اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہے اس مکتب فکر کی رو سے میری شخصیت میری اپنی بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ میری شخصیت اور تمام خصوصیات تاریخی حالات کے تسلسل کا نتیجہ ہیں ۔ ایران اور اسلام کی تاریخ نے مل کر ایک مخصوص سانچہ تیار کیا ہے اور میری تمام شخصیت اور صفات اسی سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہیں ۔ اگر میں ان مخصوص تاریخی حالات کے بجائے کسی اور ماحول میں پرورش پاتا ۔ مثلاً میں

مشرقی وسطیٰ کے یورپ، انقلاب فرانس کے دور یا آج کے مغرب میں پیدا ہوتا اور اسی ماحول میں پروان چڑھتا تو میری شخصیت اپنی موجودہ شخصیت سے بالکل مختلف ہوتی، میری زبان، میری فکر و احساس، میرا اخلاق و کردار سب کچھ بدل جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری تمام خصوصیات کی تشکیل میرے اپنے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ تاریخ کے ہاتھ میں ہے۔ میں اپنے لئے جو کچھ انتخاب کرتا ہوں اس میں میرے اپنے ارادہ اور اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ میرا انتخاب تاریخی حالات کے جبر کے تابع ہے میں وہی کچھ قبول کرنے پر مجبور ہوں جو تاریخ میرے لئے منتخب کرتی یہ میں آپ سے فارسی زبان میں گفتگو کر رہا ہوں اور آپ اس زبان کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ مگر کیا میں نے اور آپ نے فارسی زبان کا انتخاب خود کیا ہے۔ نہیں! دراصل تاریخی حالات نے فارسی کو ہماری زبان بنا دیا ہے۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے اس زبان کو تاریخی جبر کے طور پر قبول کیا ہے اور اس تاریخی پس منظر میں میں مجبور ہوں کہ فارسی کو اپنی زبان کے طور پر اختیار کروں۔ دراصل میں اس زبان کے علاوہ اور کوئی زبان منتخب نہیں کر سکتا۔ یہی صورت حال مذہب کی ہے۔ میں اور آپ مسلمان ہیں مگر کیا ہم نے اپنے مذہب کے طور پر اسلام کو آزادانہ طور پر منتخب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے دراصل ہمارا مذہب بھی ہماری تاریخ کا جبر ہے جس میں ہماری رائے اور ارادہ کا دخل نہیں ہے۔ ہم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، جن حالات میں پروان چڑھے وہ ماحول اور حالات تاریخ کے بنائے ہوئے ہیں جس طرح ہماری جسمانی خصوصیات اور ہمارا رنگ روپ طبعی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہماری روحانی حالت بھی تاریخی حالات کا نتیجہ ہوتی ہے اس میں ہمارے اپنے انتخاب کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

عمرانی جبریت

دوسرا مکتب فکر عمرانی جبریت کا ہے اس مکتب فکر میں اساسی اہمیت عمرانی اور اجتماعی نظام کو حاصل ہے۔ فرد جو کچھ ہے اجتماعی نظام کا عکس ہے، فرد کی شخصیت اور اس کی تمام خصوصیات اجتماعی ماحول کے جبر کا نتیجہ ہیں۔ اس مکتب فکر کے مبلغین انسانی شخصیت کی تعمیر میں فطرت اور تاریخ کے اثرات کو تسلیم کرتے ہیں مگر وہ ان اثرات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اس مکتب فکر کا دعویٰ ہے کہ افراد کی شخصیت کی تعمیر میں فیصلہ کن عنصر اجتماعی ماحول اور اجتماعی نظام ہے۔

اگر کسی انسان میں سخاوت، غیرت اور شجاعت کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اگر کسی انسان کی شخصیت دولت کے گرد گردش کرتی ہے اور وہ ہمیشہ دولت کمانے کی دھن میں نظر آتا ہے تو یہ بورژائی نظام کا اثر ہے اور اگر کوئی

شخص بہت اچھا شہسوار اور سپاہی ہے تو یہ صفات اس میں قبائلی زندگی کے اثرات سے پیدا ہوتی ہیں۔ گویا ہر فرد کی شخصیت نظام اجتماعی سے متاثر ہوتی ہے۔ افراد کی خصوصیات، اجتماعی نظام کی خصوصیات کے تابع ہوتی ہیں۔ اجتماعی نظام جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے یعنی اجتماعی روابط، پیداوار اور ملکیت کا نظام، ذرائع پیداوار، طبقاتی روابط، رسوم ورواج عقائد اور روایات یہی وہ عوامل ہیں جو فرد کی شخصیت تعمیر کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی فرد خود اپنے عمل کا ذمہ دار نہیں ہے اگر کوئی برا ہے تو وہ اس لئے برا ہے کہ اجتماعی نظام نے اسے برا بننے پر مجبور کر دیا ہے اور اگر کوئی نیک ہے تو وہ اس لئے نیک ہے کہ اجتماعی ماحول نے اسے اسی طرح بنایا ہے۔ اس پر یہ نیکی مسلط کی گئی ہے۔ انسان اپنے لئے نیکی یا بدی کا خود انتخاب نہیں کرتا بلکہ اس کا اجتماعی نظام اسے نیک یا بد ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس مکتب فکر میں فرد کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہر شخص بس وہی ہے جو اجتماعی نظام اسے بنا دیتا ہے۔ اس میں فرد کے اپنے انتخاب یا ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مکتب فکر میں انسان بحیثیت انسان کوئی وجود نہیں رکھتا۔

دراصل انسان وہ ہے جس کی اپنی خودی ہو۔ جس کا اپنا تشخص اور انفرادیت ہو جو "میں" کہہ سکے۔ جو یہ کہہ سکے کہ میں نے یہ انتخاب کیا اور میرے اس انتخاب کی بنیاد یہ دلائل ہیں اور یہ کہ اسے یہ اختیار ہو کہ وہ کسی بات کو منتخب کرے یا نہ کرے اور پھر وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے دلائل اور براہین کی روشنی میں اپنے لئے کسی شئے کو منتخب کرے۔ انسان ہونے کی یہی شان ہے۔ مولانا رومی فرماتے ہیں۔

ایں کہ گوئی ایں کنم یا آں کنم
خود دلیل اختیار است اے صنم

یعنی انسان کا یہ کہنا کہ میں یہ کروں یا وہ کروں خود اس کے اختیار کی دلیل ہے مگر عمرانی جبریت کا کہنا ہے کہ انسان کے اندر یہ کشمکش اور تردد بھی اجتماعی ماحول کا پیدا کردہ ہے۔ بعض اجتماعی عوامل انسان کو کسی ایک شئے کے انتخاب پر مجبور کرتے ہیں جبکہ بعض دوسرے عوامل اسے کسی دوری شئے کے انتخاب کی دعوت دیتے ہیں اور انسان ان اجتماعی عوامل کے متضاد اثرات کے نتیجہ میں تردد اور تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ آج کل اکثر لوگ اس کشمکش کا شکار ہیں کہ وہ دین کا انتخاب کریں یا بے دینی کا۔ اب عمرانی جبریت کے مکتب فکر میں اس بات کی توجیہ یوں کی جائے گی کہ انسان کے اندر دین یا بے دینی کے انتخاب کی کشمکش کا سبب انسان کی یہ آزادی اور اختیار نہیں ہے جس کے تحت وہ دین یا بے دین کو منتخب کرنے کی قدرت رکھتا ہے بلکہ انسان کے اندر یہ کشمکش اور تردد اجتماعی ماحول اور اس ماحول کی کشمکش اور تضاد کا نتیجہ ہے۔ یعنی صورت یہ ہے کہ اجتماعی نظام کے بعض عوامل انسان کو اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ دین کو اپنائے جبکہ مغربی اثرات اور دور جدید کے افکار و نظریات نے اجتماعی نظام میں ایک ایسی جہت کا اضافہ کر دیا ہے جو انسان کو مذہب کی تردید کرنے اور لادینی اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ گویا ہر انسان اجتماعی عوامل کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے اگر وہ اپنے لئے دین کا انتخاب کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شخصیت پر معاشرے کی دینی روایت غالب آگئی ہے اور اگر اس کے برعکس وہ لادینی کو منتخب کرتا ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اس کی شخصیت پر لادینی رجحانات نے تسلط اور غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان خود

اپنے لئے کوئی شئے منتخب نہیں کرتا بلکہ اس کا انتخاب بہر صورت معاشرتی اور اجتماعی عوامل کا جبر ہوتا ہے گویا انسان بحیثیت انسان کوئی وجود نہیں رکھتا۔ نہ اس کی کوئی انفرادیت ہے اور نہ خودی اجتماعی عوامل اسے جیسا چاہتے ہیں بنا دیتے ہیں۔

حیاتیاتی جبر(BIOLOGICISM)

تیسرا مکتب فکر حیاتیاتی جبر ہے - انسان شناسی کا یہ مکتب بجائے خود بیسویں صدی کے دانشوروں کی اس خواہش اور کوشش کا آئینہ دار ہے کہ وہ انسان کو مادیت کے محدود اور منجمد پیمانوں سے ناپنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ وہ انسان کی حقیقت کو مادیت کی سطح سے نسبتاً بلند سطح پر دیکھنا چاہتے ہیں گویا سترہویں صدی سے انیسویں صدی تک فکر پر مادیت کا جو غلبہ اور تسلط تھا بیسویں صدی نے اس کو رد کر دیا ہے اور اب انسان شناسی کے لئے کچھ نئے مکاتیب فکر وجود میں آگئے ہیں جن میں سے ایک اہم مکتب حیاتیاتی جبر کا مکتب فکر ہے۔

اس مکتب فکر میں انسان کی تعریف اس کی جسمانی اور نفسیاتی خصوصیات اور کیفیات کے اعتبار سے کی جاتی ہے - انسان جسمانی اور نفسیاتی کیفیات اور خصوصیات کا پیچیدہ مگر بے حد ترقی یافتہ مجموعہ ہے اور اس کی زندگی ان قوانین کے تابع ہے جو حیاتیات کے اصول وضع کرتے ہیں - یہ درست ہے کہ اس مکتب فکر میں انسان کو مادیت پرستی یا فطرت پرستی کی سطح سے نسبتاً

بلند تر سطح پر دیکھا جاتا ہے مگر اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس مکتب فکر میں انسان کی خود آگاہی کی اور آزادی کی نفی ہو جاتی ہے اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہر شخص کی شخصیت اس کی جسمانی خصوصیات کے جبر سے تشکیل پاتی ہے انسان کی خود آگاہی یا آزادی اس شخصیت کی تعمیر میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔ اس اعتبار سے کسی شخص کی کوئی انفرادیت یا خودی نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ دبلے پتلے لوگ جذباتی ہوتے ہیں اور فربہ اندام لوگوں میں محبت کا جذبہ شدید ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان میں جو خصوصیات ہیں ان کا اس نے خود انتخاب نہیں کیا بلکہ یہ خصوصیات اس کی جسمانی ساخت کا نتیجہ اور جبر ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھ سے لطف و محبت سے پیش آتا ہے تو مجھے اس کا ممنون ہونے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ یہ مہربانی خود اس شخص کا انتخاب نہیں ہے بلکہ یہ اس کی جسمانی ساخت کا جبر ہے۔ حیاتیاتی عوامل اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ محبت سے پیش آئے اور اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی جسمانی ساخت کے تقاضوں کو رد کر کے کوئی آزادانہ انتخاب کر سکے۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مکتب فکر اگرچہ اس بات کا مدعی ہے کہ یہ انیسویں صدی کے تصورات کے مقابلے میں آج کے دور میں انسان کو نسبتاً بلند سطح پر دیکھتا ہے پھر بھی یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ اس مکتب فکر میں انسان کی اس حقیقت کی نفی کی جاتی ہے جو اسے الٰہی صفات کا پرتو قرار دیتی ہے اور جو مذہب کا نقطۂ نظر ہے۔ (جس کی طرف ہم نے اپنی گفتگو کے ابتدائی حصہ میں اشارہ کیا تھا)۔

چہار زندان

اب یہ بات روشن ہوگئی ہوگی کہ میں نے جن چار زندانوں کی طرف اشارہ کیا تھا وہ کیا ہیں۔ انسان کے متعلق مختلف مکاتیب فکر کا خلاصہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسان چار زندانوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہ زندان مختلف قسم کے چار جبر ہیں جن کا وہ شکار ہے۔

پہلا جبر فطرت کا جبر ہے، دوسرا مادیت کا جبر ہے، تیسرا جبر جبر تاریخ ہے اور چوتھا جبر جامعہ ہے۔

مادیت پرست انسان کو محض مادے کے حدود میں دیکھتے ہیں۔ فطرت پرست اسے فطرت کی دوسری موجودات کی طرح ایک ایسی مخلوق سمجھتے ہیں جسے فطرت جس سانچے میں چاہتی ہے ڈھال دیتی ہے۔ جبر تاریخ کے دعویدار تاریخی حالات کو انسانی شخصیت کی تعمیر کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، اگر ایمرسن ہے

پوچھا جائے کہ تاریخ کیا ہے تو وہ جواب دے گا۔ تاریخ کیا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے ساختۂ تاریخ ہے۔ ہر انسان کی ماہئیت اور کیفیات تاریخ بناتی ہے، انسان تاریخ کو نہیں بناتا بلکہ تاریخ انسان کو بناتی ہے، عمرانی جبریت کا نظریہ یہ ہے کہ فرد کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے فرد وہی کچھ ہے جو اس کا اجتماعی ماحول اسے بنادے۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ میں فطرت، معاشرے یا تاریخ کے اثرات کا یکسر منکر نہیں ہوں۔ میں انسانی شخصیت کی تعمیر میں ان عوامل کی اہمیت اور حیثیت کو تسلیم کرتا ہوں لیکن میرا کہنا یہ ہے اور یہی میری فکر کا اصل نکتہ ہے کہ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو آزادانہ انتخاب کی صلاحیت رکھتا ہے اور "بشر" "جب" انسان بننے" کے ارتقائی مراحل طے کرتا ہے تو وہ جبر کے ان حصاروں کو توڑ کر اپنے آپ کو ان زندانوں سے آزاد کر سکتا ہے۔

انسانی شخصیت کی تعمیر اور اس کی ماہئیت کی تشکیل میں مادہ، فطرت جامعہ اور تاریخ کے جبر کا انکار قطعی طور پر ممکن نہیں ہے، مثلاً ایک قبائلی معاشرے کے افراد کی عادات واطوار اور ان کی جسمانی اور روحانی خصوصیات دیگر معاشروں کے افراد سے الگ پہچانی جاسکتی ہیں اور یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ قبائلی زندگی گذارنے والے افراد میں جو مخصوص خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ ان خصوصیات کا خود انتخاب نہیں کرتے بلکہ قبائلی زندگی کا ماحول ان خصوصیات کا متقاضی ہوتا ہے، یہ مخصوص اجتماعی اور پیداواری نظام ہوتا ہے جو زندگی کی خصوصیات کو تشکیل دیتا ہے اور یہ صحرائی یا کوہستانی ماحول ہوتا ہے جو انھیں سخت کوشی، کشمکش اور شکار کرنے کی صفات سے متصف کرتا ہے۔ غرض قبائلی، زندگی گذارنے والے افراد کی اپنی مخصوص

خصوصیات ہوتی ہیں اسی طرح زرعی معاشرے یا صنعتی معاشرے کی اپنی خصوصیات ہیں - دیہاتی زندگی اور شہری زندگی کے اپنے تقاضے ہیں اور ہر نظام پیداوار اور ہر اجتماعی ماحول اپنے افراد پر لازمی اثرات مرتب کرتا ہے - ان کی عادات اور خصوصیات اخلاق و کردار، روایات، رسوم و رواج اور عقائد اس سے متاثر ہوتے ہیں، ہر نظام اجتماعی اپنے افراد کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے اس میں ان افراد کے اپنے انتخاب کا عمل دخل نہیں ہوتا - دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان جب تک وہ بشر کی سطح پر ہے وہ فطرت، تاریخ اور معاشرے کے جبر کا شکار ہے - اس کا وجود ان عوامل کے زندانوں میں مقید ہے لیکن جب وہ ان جبر کے زندانوں سے اپنے آپ کو آزاد کرتا ہے اور جب وہ آزادانہ انتخاب کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو گویا وہ بشر کی سطح سے بلند ہو کر انسان کی سطح تک پہنچتا ہے -

انسان پر خارجی ماحول اور حالات کس قدر اثرانداز ہوتے ہیں اس سلسلے میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں - تہران کے ایک ماہر قالین ساز نے مجھے بتایا کہ ایک بار اسے حکومت کی طرف سے یہ دعوت دی گئی کہ وہ قید خانہ میں مقید قیدیوں کو قالین سازی کی تربیت دے - اس نے یہ شرط رکھی کہ اگر اس کی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں کوئی قیدی فن قالین بافی میں مہارت حاصل کرے گا تو اسے آزاد کر دیا جائے گا - اس شرط کی منظوری کے بعد اس ماہر قالین ساز نے جیل کے قیدیوں کو قالین بافی میں تربیت دینے کا کام شروع کر دیا - اس شخص کا کہنا ہے کہ مجھے جن لوگوں کی تعلیم و تربیت کا کام سونپا گیا تھا ان میں سے بیشتر خطرناک مجرم تھے اور جرم و شرارت ان کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی - بہرحال میں نے ان لوگوں کو قالین بافی کی تربیت کا کام شروع کیا - قالین بافی ایک لطیف فن ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک دشوار اور صبر آزما فن

بھی ہے ۔ اس کام میں آنکھوں کی بصارت ، انگلیوں کی مہارت اور ذوق کی لطافت، نہایت ضروری ہے تاکہ انسان صحیح رنگوں کا انتخاب کر سکے ۔ رنگوں کے امتزاج سے حسین نقش و نگار بنا سکے اور اپنی محنت اور ذوق لطیف کے نتیجہ میں ایک حسین صنعت تخلیق کر سکے ۔ ہمارے ماہر قالین باف کا کہنا ہے کہ میں نے قیدیوں کو قالین بافی کے اصول سمجھا کر پھر انھیں خود کام کرنے کی دعوت دی اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ وہ لوگ جو خطرناک مجرم تھے اور جن کو دیکھ کر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کے اندر کسی لطیف و نازک فن کو سمجھنے کی صلاحیت ہوگی ۔ انھوں نے قالین بافی کے فن کو نہ صرف سمجھ لیا بلکہ اس کے نہایت حسین نمونے بھی تخلیق کئے ۔ اس فن سے تعلق نے ان کی روح میں لطافت اور نزاکت پیدا کر دی اور وہ لوگ جنھیں کشت و خون میں مزا آتا تھا اب تصوف کے اشعار سے لطف اندوز ہونے لگے ۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر ان اشعار کو سن کر ان کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو جاتے تھے ۔ ان قیدیوں کے مزاج میں یہ تبدیلی قالین بافی کی تربیت اور اس صنعت سے تعلق کا نتیجہ تھی ۔ وہ لوگ جو اس قدر وحشی اور سنگدل تھے کہ ان کی عادت کشت و خون تھی اب اس قدر رقیق القلب ہو گئے کہ عرفانی اشعار سن کر ان کی آنکھیں اشکبار ہونے لگیں ۔ اس کا کیا مطلب ہوا ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کی خشونت یا لطافت دونوں کیفیات خارجی عوامل کا جبر اور خارجی ماحول کی پیداوار ہیں ۔ مکتب جبر اجتماعی کا یہی دعویٰ ہے اور بظاہر حالات درست ہے ۔

جبر اور آزادی

لیکن میرا بنیادی معروضہ یہ ہے کہ میں اجتماعی ماحول ، مادیت ، فطرت یا تاریخ کے جبر کی نہ یکسر نفی کرنا چاہتا ہوں اور نہ مکمل طور پر اس کی تائید کرتا ہوں بلکہ میرا نکتۂ نظر یہ ہے کہ انسان جب انسان ہونے کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے جب وہ بشریت سے انسان تک کا فاصلہ طے کر کے اپنی تکمیل کرتا ہے تو اس کے لیئے ان چار زندانوں کی قید سے رہائی حاصل کرنا ممکن ہو جاتا ہے ۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ بشر کے انسان بننے کا مرحلہ اسی وقت شروع ہوتا ہے جب فرد اپنے آپ کو ان چار زندانوں سے رہا کرنے کا آغاز کرتا ہے ۔

مثال کے طور پر جغرافیائی اثرات کو لیجئے ۔ ابن خلدون تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ہر معاشرے کی زندگی کی حالت اس کے جغرافیائی ماحول کے تقاضوں سے تشکیل پاتی ہے ۔ اپنی جگہ یہ بات درست نظر آتی ہے ۔ انیسویں

صدی میں مرکزی اہمیت جامعہ شناسی کو حاصل تھی لیکن آج یہ صورت نہیں ہے - آج ہم یہ بات سمجھتے ہیں کہ انسان جس حد تک اپنی تکمیل کے مدارج طے کرتا ہے اسی قدر وہ جبر کے ان حصاروں سے آزادی حاصل کر لیتا ہے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ یہ چار مختلف قسم کے جبر وجود نہیں رکھتے یا یہ کہ انسانی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتے اور انسان ہر قسم کے جبر سے بے نیاز آزادانہ طور پر انتخاب کرتا رہا ہے بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک انسان جبر کے ان زندانوں میں مقید رہتا ہے جب تک وہ جامعہ، فطرت یا تاریخ کے جبر کا شکار رہتا ہے وہ حیوان کی سطح سے بلند نہیں ہو سکتا اور جب انسان حیوان کی سطح سے بلند ہو کر انسان بننے کے مرحلے میں داخل ہوتا ہے تو وہ خود کو جبر کے ان حصاروں سے آزاد کر لیتا ہے -

آزادی ..... مگر کیونکر

اب ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ انسان جبر کے ان چار زندانوں سے کس طرح آزادی حاصل کر سکتا ہے۔

سب سے پہلے فطرت کے جبر کو لیجئے اس لئے کہ یہ بات سب سے زیادہ آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔ دراصل ہماری صدی (بیسویں صدی) فطرت کے جبر سے آزادی کی صدی ہے۔ جبر فطرت کی ایک صورت آب و ہوا کا اثر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آب و ہوا کے اختلاف سے انسانوں کی صفات مختلف ہوتی ہیں۔ وہ لوگ جو خشک اور بنجر علاقوں میں رہتے ہیں ان کی صفات دریا کے کنارے رہنے والوں کی صفات سے مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح مشرق اور مغرب کی آب و ہوا اور ہے اور میدانی آب و ہوا اور ہے۔ اسی لحاظ سے مرد کہستانی اور مرد میدانی کی صفات آپ کو مختلف نظر آئیں گی۔ مختصر یہ کہ ہر علاقے کی آب و ہوا اس علاقے کے باشندوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور آب و ہوا

کے اختلاف سے لوگوں کے مزاج اور عادات واطوار میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ جدید صنعت و تمدن کے نتیجہ میں انسان جبر فطرت سے روز بروز آزاد سے آزاد تر ہوتا جارہا ہے آج کے دور میں افریقہ میں رہنے والا انسان سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت اپنے لئے وہی ماحول اور حالات فراہم کر سکتا ہے جو مثلاً شمالی امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ گویا انسان جغرافیائی اثرات کے جبر سے آزاد ہو کر اپنے ماحول کو بدلنے پر قادر ہو گیا ہے۔ جبر فطرت کی ایک اور اہم شکل کشش زمین کا اثر ہے۔ بہت دنوں تک انسان یہ سمجھتا رہا ہے کہ زمین کی کشش خود اس کی ذات کا جزو ہے اور اس سے رہائی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے مگر آج کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ جبر کا یہ حصار ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ آج انسان کشش کے اس حصار کو توڑ کر خلاء میں آزادانہ پرواز کر رہا ہے۔ اسی طرح زراعت کا معاملہ اب قدرتی آب و ہوا پر منحصر نہیں ہے بلکہ اب مصنوعی بارش اور دیگر ذرائع سے زمین کو سیراب کرنے کے طریقے دریافت کر لئے گئے ہیں جدید صنعت و تمدن کے ذریعہ بے آب و گیاہ اور خشک زمینوں کو سبزہ زاروں میں بدلا جاسکتا ہے اور بنجر زمین کو زرخیز زمین بنایا جاسکتا ہے، یہ جبر فطرت سے انسان کی آزادی کا اعلان ہے۔

ٹیکنالوجی

مگر سوال یہ ہے کہ جبر فطرت سے آزادی کا وسیلہ کیا ہے؟ یہ وسیلہ فطرت کا علم ہے۔ ان قوانین کا علم ہے جو قوانین فطرت کہلاتے ہیں اور اس بات کا علم ہے کہ فطرت کے یہ قوانین انسان پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اصطلاح میں یہ علم سائنس کہلاتا ہے۔ سائنس علم فطرت ہے یعنی فطرت کے قوانین اور ان قوانین کے انسان پر اثرات کا علم اور جب انسان یہ علم حاصل کرتا ہے تو وہ اس علم کو جسے سائنس کہتے ہیں اپنی صلاحیت تخلیق کے ذریعہ ٹیکنالوجی میں ڈھال لیتا ہے۔ ٹیکنالوجی کا صرف ایک کام ہے یعنی انسان کو جبر فطرت سے آزادی دلانا۔

ٹیکنالوجی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے انسان کی انسانیت کو مسخ کر دیا ہے اور ایک اعتبار سے یہ درست بھی ہے۔ لیکن یہ تیکنیک فطرت کے جبر سے انسان کی نجات دہندہ ہے۔ انسان کو اپنی بنیادی ضروریات، خوراک،

لباس اور مکانات کے لئے دن میں بارہ گھنٹے محنت کرنی پڑتی تھی۔ ٹیکنالوجی نے محنت کے اس وقفہ کو گھٹا کر ایک یا دو گھنٹہ کر دیا اور انسانیت کا باقی وقت دوسری سرگرمیوں کے لئے آزاد کر دیا۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کے عہد کا انسان، عہد ماضی کے انسان کے مقابلے میں زیادہ وقت کام کرتا ہے مگر اس کی ذمہ داری ٹیکنالوجی پر نہیں ہے بلکہ اس کا ذمہ دار وہ بورژائی معاشرہ ہے جو اپنی صنعتی پیداوار کو کھپانے کے لئے انسانوں کو زیادہ سے زیادہ مصرف بنانا چاہتا ہے اور انسان زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی دھن میں زیادہ سے زیادہ کمانے پر مجبور ہے۔

بہر حال یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ٹیکنالوجی انسان کی نجات دہندہ ہے جو سائنس کے علم کی مدد سے انسانوں کو فطرت کے جبر سے آزادی دلاتی ہے سائنس کے ذریعہ انسان فطرت کا علم حاصل کرتا ہے یہ علم فطرت کی تسخیر کے لئے راہ ہموار کرتا ہے اور انسان علم کو ٹیکنالوجی میں ڈھال کر فطرت کو مسخر کر لیتا ہے۔

گویا جبر فطرت سے آزادی کا ذریعہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہے۔

تاریخ شناسی

جبر تاریخ سے آزادی کا ذریعہ تاریخ شناسی ہے۔

اگر انسان اس بات کا شعور حاصل کر لے کہ وہ عظیم قوت جسے تاریخ کہا جاتا ہے کس طرح انسانوں کو اپنا کھلونا بنا لیتی ہے، اگر وہ فلسفۂ تاریخ کو سمجھ لے کہ تاریخ کا دھارا کس طرح بہتا ہے اور کون سے قوانین تاریخ کی حرکت کو معین کرتے ہیں، اگر وہ تاریخی عوامل کا سراغ لگا لے اور یہ سمجھ لے کہ تاریخی عوامل انسان کے فکر و ارادہ، جذبات و اخلاق کو کس طرح متاثر کرتے ہیں تو پھر وہ تاریخ کے جبر سے آزادی کی راہ تلاش کر سکتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ آج کے دور میں تاریخ شناسی کے علم نے اس قدر ترقی کر لی ہے جس کے نتیجہ میں انسان، جبر تاریخ سے آزادی حاصل کر رہا ہے۔

آج کے دور میں ایشاء افریقہ اور لاطینی امریکہ میں ایسے معاشرے موجود ہیں جو جبر تاریخ کے مروجہ اور متعین اصولوں کے علی الرغم تیزی سے ترقی کے مراحل طے کر رہے ہیں ۔ تاریخی مراحل کا ارتقاء مروجہ اصولوں کے مطابق اس طرح ہوتا ہے کہ ایک معاشرہ تاریخ کے ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک کا فاصلہ صدیوں میں طے کرتا ہے اور یہ ارتقاء مرحلہ وار ہوتا ہے یعنی معاشرہ تاریخ کے ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں پھر تیسرے مرحلے میں، پھر چوتھے، پانچویں اور چھٹے مرحلہ میں داخل ہونے پر مجبور ہے، یہ جبر تاریخ کا نظریہ ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ معاشرے جس قدر تاریخی شعور حاصل کرتے جارہے ہیں اور جس حد تک ان کے دانشور تاریخی عوامل اور ان عوامل کے اثرات و نتائج سے باخبر، ہوتے جارہے ہیں اسی نسبت سے ان معاشروں کے تاریخی ارتقاء کی رفتار تیز ہوتی جارہی ہے ۔ مثلاً ایک معاشرہ جو تاریخی ارتقاء کے تیسرے مرحلے میں ہے جبر کے اصولوں کے خلاف چوتھے اور پانچویں مراحل سے گذرے بغیر ارتقاء کے چھٹے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے ۔

تاریخ کے ہر دور میں ہر معاشرہ کا ارتقائی سفر تاریخ کے جبر کا پابند رہا ہے اور تاریخ ایک مرحلہ کے بعد دوسرے مرحلہ میں بتدریج داخل ہوتی رہی ہے ۔ تاریخ کا یہ مرحلہ وار سفر تاریخ کا جبر ہے اور معاشرتی زندگی اس جبر کے حصار سے اسی وقت باہر نکل سکتی ہے جب تاریخ، اس کے قوانین اور عوامل کا شعور حاصل کیا جاسکے ۔ آج کا انسان تاریخ کی آگاہی اور شعور حاصل کر رہا ہے وہ تاریخ کی حرکت کے عوامل اور قوانین کو منکشف کر رہا ہے اور جس حد تک وہ تاریخ شناسی کے میدان میں آگے بڑھ رہا ہے اسی نسبت سے وہ اپنے آپ کو جبر تاریخ سے آزاد کر رہا ہے ۔ وہ تاریخی ارتقاء کے معین مراحل سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے ارتقاء کا راستہ خود منتخب کر رہا ہے ۔ گویا انسان جس حد تک تاریخ کا

شعور حاصل کرتا ہے اسی حد تک وہ تاریخی جبر سے آزاد ہو جاتا ہے یہی سبب ہے کہ ایک معاشرہ جو کل تک بدوی، قبائلی یا غلامی کے دور میں تھا۔ آج یک لخت صنعتی اور بورژوائی مرحلہ میں داخل ہو رہا ہے۔ معاشرے کا یہ انقلابی ارتقاء تاریخ کے جبری ارتقائی عمل سے بالکل مختلف اور متضاد ہے اور یہ تاریخ کی شناخت اور تاریخی قوانین و عوامل کے انکشاف کے ذریعہ معاشرے کو تاریخ کے جبر سے آزاد کرانے کا طریقہ ہے۔

تیسرا مرحلہ جس کا انسان شکار ہے عمرانی جبر ہے، دور گذشتہ میں ہر فرد اپنے معاشرے کے تقاضوں کے مطابق تربیت پاتا تھا، مگر آج کے دور میں جامعہ شناسی کا علم ترقی کر رہا ہے۔ اجتماعی اور طبقاتی روابط کی حقیقت منکشف ہوتی جارہی ہے انسان فلسفۂ سیاست و حکومت کو سمجھتا جارہا ہے۔ اس کا اجتماعی شعور ترقی کر رہا ہے اور جامعہ شناسی کے نتیجہ میں بجائے اس کے معاشرے افراد کی ساخت متعین کریں، افراد معاشرتی ہیئت کو تبدیل کر رہے ہیں، دور گذشتہ میں جب انسان قبالی، بدوی یا زرعی معاشرے مین زندگی گذارتے تھے تو کسی فرد کے ذہن میں اپنے معاشرے کے نظام حکومت، نظام مذہب، عقیدے یا روایت کے متعلق کوئی معمولی سا شک و شبہ بھی سر نہیں اٹھاتا تھا۔ دراصل ان معاشروں کے افراد کے لئے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ان باتوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں۔ ان کے لئے یہ تمام باتیں بدیہی ابدی، لازوال اور ناقبل تغیر حقیقتیں تھیں۔ وہ ان سماجی عوامل کو فطری مظاہر جیسے آفتاب اور آسمان کی طرح روشن اور ثابت شدہ اور ناقابل تغیر سمجھتے تھے ان کے ذہن میں ان باتوں کے خلاف شک و شبہ کرنے یا ان سے بغاوت کرنے یا ایک نظام کو مسترد کر کے دوسرے نظام کو منتخب کرنے کا کوئی تصور پیدا ہونا ممکن ہی نہیں تھا، ان افراد کو ان کے اجتماعی نظام نے جس

سانچے میں ڈھال دیا تھا اسے انھوں نے بے چون وچرا تسلیم کر لیا تھا۔ اس لئے کہ انکی ذہنی اور فکری تربیت ان خطوط پر ہوئی تھی کہ ان کے لئے اپنے اجتماعی نظام کی کسی شق کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنا ممکن نہیں تھا لیکن آج کا انسان اگر کسی مذہب کو بھی اختیار کرتا ہے تو اپنے اختیار اور آگاہی کے ساتھ اختیار کرتا ہے اور اگر اس کو رد کرتا ہے تو بھی آگاہی اور اختیار کے ساتھ رد کرتا ہے یعنی آج کے انسان کا طریق فکر و عمل دور گذشتہ کے انسان سے مختلف ہے اور زاویہ ہائے فکر و عمل کا یہ اختلاف عملی ترقی کا نتیجہ ہے۔

وہ عوامل جو اجتماعی جبر کے طور پر مسلط ہو جاتے ہیں یا اس کو متاثر کرتے ہیں۔ ان میں مذہب بڑی اہم حیثیت رکھتا ہے مگر آج کے دور میں انسان ان اثرات سے بڑی حد تک آزاد ہو چکا ہے اس پر اجتماعی نظام کا تسلط ہو چکا ہے اب کسی فرد پر کوئی مذہب جبراً مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ اب انسان کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ کسی مذہب کو رد کر دے یا قبول کرے، پیداواری نظام، اقتصادی نظام، ملکیت کا نظام، اجتماعی روایات اور روابط، طبقاتی رابطے، خاندان اور اجتماعی حقوق و فرائض جنھیں ماضی میں ازلی اور ابدی۔ ناقابل تغیر سمجھا جاتا تھا اور جنھیں مقدس آسمانی اور غیب سے نازل شدہ قوانین کی حیثیت حاصل تھی۔ اب اپنی قدیم حیثیت کھو چکے ہیں۔ آج کا انسان ان باتوں کو ایک جبری حقیقت کے طور پر قبول نہیں کرتا انھیں ناقابل ترمیم و اصلاح نہیں سمجھتا، انھیں آسمان سے نازل شدہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ ان تمام امور کے متعلق غور و فکر کر کے خود فیصلہ کرتا ہے، خود انتخاب کرتا ہے اجتماعی عقائد و نظریات، روایات اور رسول و رواج پر تنقید کرتا ہے۔ ان میں ترمیم و اصلاح کر سکتا ہے، ان کو یکسر تبدیل کر سکتا ہے اجتماعی نظام اور مذہب میں انقلاب اور تغیر برپا کر سکتا ہے اور یہ سب باتیں اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں

کہ انسان خود کو اجتماعی نظام کے جبر سے کم و بیش آزاد کر چکا ہے اور ہر روز اس کی آزادی کی حد میں مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

انسان خود کو معاشرتی اور عمرانی جبر سے کس طرح آزاد کر سکتا ہے؟ جامعہ شناسی اور علوم اجتماعی کے وسیلہ سے دور حاضر کا انسان نظام ہائے اجتماعی کے مطالعہ تجزیہ اور تقابل کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنی اسی علمی صلاحیت کی بدولت بالفاظ دیگر جامعہ شناسی کے ذریعہ خود کو جبر جامعہ سے آزاد کر لیتا ہے۔ جس طرح ٹیکنالوجی فطرت کے جبر کے خلاف جنگ کرنے کا وسیلہ ہے۔ اسی طرح آئیڈیالوجی بوسیلہ و براساس علم جامعہ شناسی نظام ہائے اجتماعی کے جبر و تسلط کے خلاف جدوجہد کا قرینہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ زندان اول یعنی زندان فطرت سے رہائی کا ذریعہ علم فطرت ہے جسے سائنس کہتے ہیں۔ جب انسان فطرت کا علم حاصل کرتا ہے تو پھر اس کے لئے تسخیر فطرت ممکن ہو جاتی ہے اسے فطرت کے جبر سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعہ انسان فطرت کے جبر و حصار سے آزاد ہو کر اپنی خود آگاہی آزادی اور تخلیقی صلاحیت کو بازیافت کر سکتا ہے۔

زندان دوم یعنی زندان تاریخ سے رہائی کا وسیلہ بھی علم ہے۔ علم تاریخ کے ذریعہ انسان تاریخ کے فلسفہ کو سمجھتا ہے اور تاریخی عوامل کے جبر و تسلط سے خود کو آزاد کر لیتا ہے۔

زندان سوم یعنی زندان نظام اجتماعی سے رہائی کا وسیلہ بھی علم ہے، جب انسان عمرانی علوم سے آگاہی حاصل کرتا ہے تو وہ خود کو اجتماعی نظام کے جبر سے آزاد کر لیتا ہے اور اجتماعی نظام میں اپنے ارادے سے ترمیم و اصلاح کر سکتا ہے۔

زندان ذات

زندان چہارم زندان ذات ہے - انسان خود اپنی ذات کے خول میں محصور ہے اور یہ مذکورہ بالا تینوں زندانوں کے مقابلہ میں بدترین زندان ہے انسان اس قید کے مقابلہ میں سب سے زیادہ عاجز اور مجبور نظر آتا ہے - حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آج کا انسان تینوں زندانوں، فطرت، تاریخ اور معاشرے کے زندانوں سے ماضی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ آزاد ہو چکا ہے اور فطرت، تاریخ اور معاشرے کے عوامل کو مسخر کر چکا ہے لیکن اس کے برعکس جہاں تک چوتھے زندان یعنی زندان ذات کا تعلق ہے اس قید کا حصار آج ماضی سے زیادہ سنگین نظر آتا ہے - انسان جب ٹیکنالوجی سے بے بہرہ تھا - جب وہ سائنسی، تاریخی اور عمرانی علوم سے ناواقف تھا اس وقت اس قید کا دائرہ اتنا تنگ اور سخت نہیں تھا جتنا آج کل نظر آتا ہے - اس چوتھے زندان کی قید کی سختی نے انسان کو دیگر تینوں زندانوں سے رہائی کے کارنامے کو بھی بیکار اور

عبث بنا دیا ہے - آج کا انسان جو فطرت، تاریخ اور معاشرے کے زندانوں سے آزاد ہو چکا ہے - اپنے آپ کو ہیچ اور پوچ محسوس کرتا ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی، صنعت تمدن اور ثقافت کی تمام ترقیوں کے باوجود اسے اپنی زندگی کھوکھلی اور بے معنی نظر آتی ہے مگر ایسا کیوں ہے؟ ایسا اس لئے ہے کہ وہ انسان جو زندان چہارم (زندان ذات) میں محصور ہے اس کے لئے دیگر تینوں زندانوں سے رہائی مسائل اور الجھنوں میں مزید اضافہ کا باعث بن گئی ہے۔

مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ جو انسان جبر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے وہ کیا کروں یا کیا نہ کروں کے تردد سے بے نیاز ہے اس لئے کہ وہ خود سے کچھ کرنے کی قدرت اور اختیار سے محروم ہے لیکن آج کا انسان اگر ایک طرف کچھ کرنے کی قدرت اور توانائی ماضی کے مقابلہ کہیں زیادہ رکھتا ہے تو دوسری طرف وہ ہمیشہ سے زیادہ آج اس بات سے بے خبر ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیئے - آج کا انسان جو تینوں زندانوں سے آزاد ہو چکا ہے جو فطرت کو مسخر کر چکا ہے جو تاریخ اور جامعہ کے جبر سے آزاد ہو کر مستقبل کی تاریخ اور اجتماعی نظام کو اپنی مرضی اور ارادے کے مطابق ڈھالنے کی قدرت حاصل کر چکا ہے وہی انسان خود اپنے زندان ذات کا اسیر ہے اور اس قید سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اس قید کا دائرہ روز بروز تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اس لئے رہائی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی جاتی ہے اور اس مشکل کی وجہ یہ ہے کہ دیگر تینوں زندان ایک خارجی حقیقت ہیں جو انسان کے وجود کو محصور کئے ہوئے ہیں، یہ وہ قفس ہیں جو انسان کے وجود سے علیحدہ ایک حقیقت ہیں اور انسان کو اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔ انسان جو ان زندانوں کا قیدی ہے وہ اپنے قیدی ہونے کا احساس رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ کشش ارض کی قوت ہے جو اس کے وجود کو

زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے اور اسی قید کا نتیجہ ہے کہ انسان ہوا میں پرواز نہیں کر سکتا۔ پرواز کے لئے ضروری ہے کہ انسان خود کو کشش ثقل سے آزاد کرے، انسان اس حقیقت سے آگاہ ہے۔ نہ صرف آج آگاہ ہے بلکہ اس وقت بھی آگاہ تھا جب سائنس اور ٹیکنالوجی نے ترقی نہیں کی تھی اور انسان بدوی دور میں زندگی گذار رہا تھا۔ وہ اس بات کو سمجھتا تھا کہ دریا کے کنارے رہنے کی مجبوری ہے کہ وہ صیاد بنے، جنگل میں رہنے کی مجبوری ہے کہ وہ شکار کرے، انسان ہمیشہ سے فطرت اور ماحول کے جبر کو محسوس کرتا رہا ہے۔ ان حصاروں میں اپنے آپ کو قیدی محسوس کرتا رہا ہے اس لئے کہ ان زندانوں کی چار دیواری اس کے وجود سے الگ ایک خارجی حقیقت ہے مگر جہاں تک زندان چہارم یعنی زندان ذات کا تعلق ہے اس کی صورت بالکل مختلف ہے اس قید خانہ کا وجود انسان سے الگ نہیں بلکہ اس مجلس کی دیواریں خود اس کے اپنے وجود کے اندر ہیں۔ یہ وہ قید خانہ ہے جو ایک داخلی حقیقت ہے یہ قفس انسان اپنے لئے خود بناتا ہے اس لئے کہ یہ اس کی انانیت کا زندان ہے یہ اس کی خودی کا قفس ہے یہ زندان ذات ہے۔ جہاں زندان اور زندانی ایک ہی ہیں۔ مرض اور مریض دونوں ایک ہیں اس لئے اس مرض سے شفا حاصل کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے۔ انسان خود صید ہے اور خود صیاد خود اس کی ذات اس کا قید خانہ ہے اس لئے اس قید سے رہائی دشوار ترین مرحلہ ہے۔ انسان زندان فطرت سے، زندان تاریخ سے، زندان معاشرے سے نجات حاصل کر چکا ہے مگر اس کے باوجود زندان ذات سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

زندان ذات سے رہائی میں ایک دشواری تو یہ ہے کہ یہاں زندان اور زندانی دونوں ایک ہی ہیں اور دوسری دشواری یہ ہے کہ انسان دیگر تینوں

زندانوں سے علم کے ذریعہ آزادی حاصل کر سکتا ہے مگر زندان ذات سے رہائی علم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے اس لئے کہ یہاں علم خود زندانی ہے اور اس کا علم ایک قیدی کا علم ہے یہی وجہ ہے کہ وہ شخص جو ایک طرف یہ کہتا ہے کہ مجھے یہ احساس ہی نہیں کہ میں نے اپنی آزادی کو خود اپنے وجود میں دفن کر دیا ہے۔ وہی شخص فطرت، تاریخ اور معاشرے کے جبر کو ایک انسان کی حیثیت سے پوری طرح محسوس کرتا ہے اور اس بات کی استطاعت اور اہلیت رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو ان زندانوں سے رہا کر سکے۔ لیکن اس رہائی اور آزادی کے باوجود وہ بے مائیگی کے احساس کا شکار ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مرحلہ پر آپ کے سامنے ایک حقیقت کو بطور کلیہ پیش کر دوں اور یہ وہ کلیہ اور قانون ہے جو انسانی تاریخ کے آغاز سے آج تک اپنی جگہ قائم ہے اور تاریخ کے ہر دور میں اس کی صحت و صداقت ظاہر اور ثابت ہے اور وہ کلیہ یہ ہے کہ جہاں تک زندگی کی مادی سطح کا تعلق ہے انسان احتیاج پہلے محسوس کرتا ہے اور اس احتیاج کی تکمیل کے وسائل بعد میں مہیا کرتا ہے اور جب اس کی مادی احتیاجات پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہیں تو وہ بے مائیگی اور بے کیفی کا شکار ہو جاتا ہے وہ زندگی کے مادی تصور کے خلاف بغاوت کر کے ترک دنیا اور رہبانیت کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔

عصر جدید میں وجودیت (ایگزیسٹانشلیزم) اور ہپی ازم مادیت کے فروغ کا لازمی رد عمل ہیں، ہماری ماضی کی تاریخ میں اشرافیت کا فروغ تصوف کے ظہور کا محرک بنا۔ ہند میں اشرافیت کا رد عمل ہندو تصوف اور نروان کے تصور کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح جدید یورژوائیت کا نظام اپنی انتہا پر پہنچ کر مادیت کی نفی کے رجحان کے فروغ کا سبب بن رہا ہے۔ جدید نسل میں ہم ان رجحانات کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہ عمل اور رد عمل کا قانون ہے

جس سے مفر یا گریز ممکن نہیں ہے۔

انسان مادی ساز و سامان میں اسی وقت تک دل کشی محسوس کرتا ہے جب تک کہ وہ ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا اور جب وہ اپنی مادی احتیاجات کی تکمیل کر لیتا ہے تو پھر اسے یہی چیزیں، سچ اور پوچ نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مادیت کو اپنا آئیڈیل بنا لیتے ہیں۔ وہ اس آئیڈیل کو حاصل کرنے کے بعد خوشی سے زیادہ بے کیفی محسوس کرتے ہیں دراصل انسان کا آئیڈیل وہ قدر اعلیٰ ہے جس تک مکمل طور پر رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ (البتہ انسان تمام عمر اس کے حصول کے لئے کوشش کرتا رہتا ہے) اس لئے کہ اگر آئیڈیل حاصل ہو جائے تو زندگی میں ٹھہراؤ اور جمود پیدا ہو جاتا ہے اور جمود بے کیفی اور بے مائیگی کے احساس کو جنم دیتا ہے۔

انسان جو زندان ذات میں محصور ہے اپنی تمام مادی ترقی کے باوجود بے کیفی اور بے مائیگی کا شکار ہے اور رہے گا۔ ژان ایزولہ (JAUN IZALA) نے ایک شاہزادہ کا کردار پیش کیا ہے جو سر سے پاؤں تک مسلح اور سونے چاندی اور جواہرات سے لدا ہوا ہے مگر جو ایک اندرونی کرب سے بے چین ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس اس درد کا کوئی علاج نہیں ہے۔۔ مصنف نے اس شاہزادہ کو جدید فرانس کی علامت قرار دیا ہے مگر ہم اسے آج کے جدید اور متمدن انسان کی علامت سمجھ سکتے ہیں۔ اس شاہزادہ کے روپ میں، ہمیں آج کے ہر اس انسان کی تصویر نظر آتی ہے جو مسلح ہے، طلائی زیورات سے لدا ہوا ہے مگر جو ہمیشہ سے زیادہ عاجز و درماندہ نظر آتا ہے۔

ہالینڈ کے شہر روٹرڈم کے ایک بڑے چوراہے پر ایک مجسمہ نصب ہے یہ مجسمہ بڑا عجیب و غریب ہے اسے پتھر سے تراشا گیا ہے مگر اس کی صورت یہ ہے کہ اس کے تمام اعضاء ایک دوسرے سے غیر مربوط ہیں مثلاً گردن اپنی

جگہ سے کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ کہنی بازو سے آگے نکلی ہوئی ہے، یہی صورت زانو، ٹخنہ اور پیروں کی ہے کہ ہر چیز جگہ سے بے جگہ نظر آتی ہے ہر عضو دوسرے عضو سے غیر مربوط دکھائی دیتا ہے اگر آپ دور سے اس مجسمہ کا نظارہ کریں تو آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ جیسے ہوا کا معمولی سا جھونکا بھی اس مجسمہ کو گرا کر ریزہ ریزہ کر دے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک سنگی مجسمہ ہے جو یوں گر کر چکنا چور نہیں ہو سکتا مجسمہ ساز نے اس مجسمہ کے ذریعہ جنگ عظیم دوم کے بعد کے انسان کی تصویر کشی کی ہے، لیکن یہ مجسمہ دراصل آج کے عہد کے ان تمام انسانوں کی علامت ہے جو طاقت اور قدرت کے لحاظ سے آج ہمیشہ سے زیادہ طاقتور ہیں مگر ہمیشہ سے زیادہ موت کے خوف کا شکار ہیں۔ آخر یہ تضاد کیوں ہے؟ اس قدر مادی ترقی کے باوجود انسان تباہی اور موت کے خوف کا شکار کیوں ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ تین زندانوں سے آزادی حاصل کرنے کے نتیجہ میں انسان کو زبردست طاقت اور قدرت حاصل ہوئی ہے۔ آج کے دور میں انسان جس قدر طاقتور ہے اتنا طاقتور اس سے پہلے کبھی نہیں تھا۔ لیکن یہی انسان جو زمین پر بیٹھے بیٹھے مریخ پر بمباری کر سکتا ہے۔ یہ صاحب عقل و دانش، یہ غیر معمولی صلاحیتوں والا انسان جو زمین پر بیٹھ کر چاند پر اترنے والے اسپوٹنک یا فضائے لامتناہی میں سیر کرنے والے آلات کو کنٹرول کر سکتا ہے وہی عظیم اور طاقت ور انسان اس قدر ضعیف اور کمزور ہے کہ دولت کے عوض اپنی تمام صلاحیتوں اور طاقتوں کو نیلام کر دیتا ہے، اس کی تمام توجہ اپنی آمدنی میں اضافہ پر مرتکز رہتی ہے اور وہ اس مقصد کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ غلامی کا ادارہ آج بھی افریقہ کے بعض نواحی علاقوں میں موجود ہے لوگ ان علاقوں میں جا کر وہاں کے پس ماندہ اور نیم وحشی لوگوں کو

خریدتے ہیں اور انھیں دوسرے علاقوں میں لے جاکر بطور غلام فروخت کردیتے ہیں لیکن غلامی کا ایک ادارہ ایسا بھی ہے جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، مغرب میں دیکھا ہے اور وہ بھی کیمبرج اور سوربون جیسے اداروں میں جو یورپ کے علمی مراکز ہیں۔ یہاں بردہ فروشی کی ایک دوسری شکل ہے، یہاں جسموں کی خرید و فروخت نہیں ہوتی بلکہ یہاں ذہنوں کا نیلام ہوتا ہے۔ صلاحیتوں کی بولی لگائی جاتی ہے۔ یہاں افریقہ کے نیم وحشی لوگوں کا بازار نہیں لگتا بلکہ اس بازار میں دنیا کے بہترین ذہن خود کو نیلام کے لئے پیش کرتے ہیں۔ چین، روس، شمالی امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے بڑے سرمایہ دار اور بڑے اداروں کے نمائندے یہاں آتے ہیں اور ان علمی مراکز کے بہترین طالب علموں کی بولی لگاتے ہیں۔ مثلاً اگر ایک کہتا ہے کہ میں پندرہ ہزار تومان معاوضہ دونگا دوسرا کہتا ہے کہ ہم اس کے علاوہ گاڑی بھی فراہم کریں گے۔ تیسرا اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم گاڑی کے ساتھ ڈرائیور بھی دیں گے لوگ اس طرح بولی لگاتے رہتے ہیں اور وہ طلباء جن کا شمار دنیا کے بہترین دماغوں میں ہوتا ہے کبھی ایک کی طرف دیکھتے ہیں، اور کبھی دوسرے کی طرف نگاہ کرتے ہیں بالآخر اپنا ایک آقا منتخب کرلیتے ہیں۔ جو سب سے بڑھ کر بولی لگاتا ہے اس کے ہاتھ اپنے آپ کو فروخت کردیتے ہیں۔ یہ عہد جدید کی غلامی کا ادارہ ہے جس میں سرمایہ اہلیت کو غلام بنالیتا ہے اور بڑے بڑے صاحبان علم و صلاحیت دولت کے عوض خود کو فروخت کردیتے ہیں۔ یہ وہ ماہرین علم ہیں جو اپنے علم کے ذریعہ انسان کو معاشرتی جبر سے آزادی دلانے والے ہیں۔ یہ وہ فلسفی اور تاریخ شناس ہیں جو زندان تاریخ سے آزادی کا مژدہ سنانے والے ہیں لیکن خود ان کی حالت یہ ہے کہ غلاموں کی طرح ان کی بولی لگائی جاتی ہے یہ لوگ خود اپنے زندان ذات میں اسیر ہیں۔ یہ اپنے حرص

ہوس کے قیدی ہیں اور اپنے حرص و ہوس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے خود کو غلام بنانے پر مجبور ہیں۔ اور ایسا انسان جو خود غلام ہو دوسروں کو غلامی سے نجات نہیں دلا سکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ زندان ذات خود انسان کی اپنی ذات میں پنہاں ہے۔ دیگر تینوں زندانوں کے برعکس جو خارجی وجود رکھتے ہیں یہ زندان داخلی ہے اور انسان کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ خود اپنی ذات کے خلاف بغاوت کر سکے اس لئے زندان ذات سے رہائی کا مسئلہ سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے۔

ایک مشکل اور ہے اور یہ بڑی زبردست مشکل ہے صورت یہ ہے کہ دیگر تینوں زندانوں سے انسان علم کے ذریعہ رہائی حاصل کر سکتا ہے لیکن زندان ذات سے رہائی علم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔

علم اور عشق

ہم نے دیکھا کہ انسان چار زندانوں میں مقید ہے:۔
زندان فطرت، زندان تاریخ، زندان جامعہ اور زندان ذات
زندان فطرت سے رہائی کا ذریعہ ہے علم یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی۔
زندان تاریخ سے رہائی کا ذریعہ بھی علم ہے یعنی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا علم
زندان جامعہ (معاشرہ) سے رہائی بھی علم ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ یہ علم عمرانیات کا علم ہے۔ لیکن زندان ذات سے رہائی علم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ اگر انسان اپنی ذات کے زندان سے آزادی چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ علم نہیں بلکہ عشق ہے۔

لیکن یہاں عشق سے میری مراد عشق کا وہ مفہوم نہیں ہے جو صوفیوں اور اہل عرفان کا مفہوم ہے اس لئے کہ اس طرح کا عشق بجائے خود زندان کی حیثیت رکھتا ہے۔

عشق سے میری مراد وہ قوت عظیم ہے جو مصلحت شناس اور حسابی عقل سے بالاتر ہے۔ یہ وہ قوت عظیم ہے جو انسان کے بطن میں پنہاں ہے جو اس کے وجود کی گہرائیوں کو اس پر منکشف کرتی ہے، یہ وہ باطنی قوت ہے جو

انسان کے نفس کی برائیوں کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ زندان ذات داخلی زندان ہے اس لئے اس سے رہائی کے لئے ایسی قوت کی ضرورت ہے جس کا سرچشمہ انسان کے باطن میں ہو، عشق ایک باطنی قوت ہے یہ وہ قوت ہے جو داخلی محاذ پر سرگرم عمل ہے۔ یہ جوش، جذبہ اور حرارت ہے یہ اپنی ذات کو منکشف کرنے والی قوت ہے، یہ اپنی ذات کی حقیقت اور اس کی گہرائی کو دریافت کرنے کا طریقہ ہے۔ عشق عقل برہانی کی طرح کام نہیں کرتا۔ اس کا طریقۂ کار طبعی قوانین کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کا طریقۂ کار عقل کے طریقۂ کار سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا کام انسان کو باطنی زندان یعنی زندان ذات سے رہائی دلانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان عقل منطقی کے ذریعہ جو طبعی قوانین کو منکشف کرتی ہے۔ زندان ذات سے رہائی کیوں حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل منطقی فطرت کے قوانین کو منکشف کرسکتی ہے۔ علم کے ذریعہ خارجی زندانوں سے رہائی دلاسکتی ہے مگر وہ انسان کے باطنی زندانوں کی دیواروں کو نہیں ڈھاسکتی اس لئے کہ یہ کام علم و منطق کا نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ منطق کے احاطے سے باہر ہے بقول پارتو یہ ایک غیر منطقی مسئلہ ہے۔

پارتو (PARETO) کا کہنا ہے کہ انسان کے افعال و اعمال کی تین قسمیں ہیں۔ منطقی، ضد منطقی اور غیر منطقی یعنی وہ افعال جو ماوراء منطق ہیں انسان زندگی کی بیشتر سرگرمیاں منطقی افعال کے ذیل میں آتی ہیں۔ ہمارا رہن سہن، لباس، کام، مطالعہ، غور و فکر، ایک دوسرے کی خوشامد اور تملق یہ سب منطق کے اصولوں کے تحت اس سے متعلق تمام سرگرمیاں منطقی سرگرمیاں ہیں اس لئے کہ ان میں علت و معلول کا سلسلہ پایا جاتا ہے ان تمام اعمال کا کچھ نتیجہ ہوتا ہے اور یہی نتیجہ ان اعمال کا محرک بھی ہے۔ ضد

منطقی سرگرمیاں وہ ہیں جو خود غرضی اور خود پسندی کا نمونہ ہیں۔
جہاں تک اعمال کی تیسری قسم کا تعلق ہے یہ نہ منطقی ہے نہ ضد منطقی بلکہ یہ منطق کے دائرے سے باہر اور اس سے ماوراء افعال ہیں۔ منطق کا تسلسل علت و معلول سے عبارت ہے اس کا احاطہ انسان کی خواہشات اور احتیاجات اور ان کی تکمیل کے اسباب و ذرائع فراہم کرنے تک محدود ہے۔ ماوراء منطق سرگرمیاں علت و معلول کے سلسلے میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتیں۔ یہاں انسان ذاتی نفع و نقصان کا حساب نہیں لگاتا بلکہ وہ نتائج سے بے نیاز ہو کر کوئی عمل سرانجام دیتا ہے۔ وہ اپنے تمام مفادات کو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے قربان کر دیتا ہے۔ یہ قربانی اور ایثار کی وہ منزل ہے جہاں انسان بالاخر خود اپنی ذات کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خود کو اس لئے نذر آتش کر دیتے ہیں تاکہ ان کا معاشرہ ظلم کی آگ سے محفوظ رہ سکے۔ وہ پورے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنے ارادہ اور اختیار سے اپنے شعور و آگاہی کو بروئے کار لاتے ہوئے خود اپنی قربانی پیش کرتے ہیں یہ عمل منطق کے احاطے سے باہر ہے۔ اگر منطق کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو اس خود سوزی کے عمل کا کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ انسان جو خود کو نذر آتش کر رہا ہے اس کا یہی عمل خود اس کی اپنی ذات کے لئے بالکل بے نتیجہ اور بے فائدہ ہے مگر یہ عشق کی منزل ہے۔ یہ اخلاق کی اصل و اساس ہے۔ یہ وہ عظیم قوت ہے جو انسان کو خود اپنی ذات کے حصار سے باہر آنے میں مدد دیتی ہے۔ ایسا انسان اپنے نفع و نقصان سے بلند ہو کر، مصلحت کے دائروں کو توڑ کر تمام ذاتی مفادات اور مصالح کو قربان کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنی ذات کو بھی قربان کر دیتا ہے اور اس کے ایسے اعمال کا مقصد دوسروں کا مفاد ہوتا ہے جب انسان میں عشق کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ تو وہ

حصار ذات سے باہر آکر زندگی کی ایک نئی سطح کو دریافت کرتا ہے، یہ قربانی و ایثار کی سطح ہے۔ جہاں انسان ان اعلیٰ قدروں کے لئے جن سے وہ محبت کرتا ہے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے اور اپنے آئیڈیل کے لئے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا ہے۔

اگر میں آپ سے دروغ گوئی سے کام نہیں لیتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ دروغ اور فریب سے کام نہ لیں، اگر میں آپ کو دھوکہ نہیں دیتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود کو آپ کے دھوکہ سے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں اگر میں کوئی جعلی چیک جاری نہیں کرتا تو اس کا بڑا محرک یہ ہوتا ہے کہ کاروبار میں میری ساکھ قائم ہو سکے اور میں چیک کے ذریعہ لین دین کر سکوں، یہ ایک تقویٰ مصلحتی ہے۔ یہ ایسی نیکی ہے جس کی اساس مفاد و مصلحت پر ہے، یہ وہ بات ہے جو عقل و منطق پر مبنی ہے لیکن اگر میں اس لئے جھوٹ نہ بولوں کہ جھوٹ بولنا بری بات ہے اگرچہ کہ اس جھوٹ نہ بولنے کے نتیجہ میں مجھے نقصان اٹھانا پڑے، اگر میں ایسے موقع پر سچ بولوں۔ جہاں سچ بولنے سے کسی مفاد کا حصول ممکن نہ ہو بلکہ جہاں سچ بولنے میں جان کا خطرہ لاحق ہو تو یہ وہ منزل ہے۔ جہاں "میں" اپنی حقیقت کو دریافت کرتا ہوں۔ اس مزم پر زندن ذات کا حصار ٹوٹ جاتا ہے انسان باطنی قید سے آزاد ہو کر ایمان و عشق کی روشنی میں تکمیل انسانیت کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔

نٹشے ایک عظیم فلسفی تھا وہ ایک نابغۂ روزگار شخص تھا جسے دنیائے علم و فلسفہ میں ایک قابل فخر مقام حاصل ہے۔ اپنی جوانی میں نٹشے طاقت کے فلسفے کا علمبردار تھا وہ طاقت ہی کو حق سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک طاقت ہی سب سے بڑی قدر تھی۔ وہ کمزوروں اور ضعیفوں کو کوئی حق دینے کے لئے تیار نہ تھا مگر یہ انداز نظر عہد شباب کا نشہ تھا جو عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ اترنے لگا تھا

اور اپنی آخری عمر میں نٹشے نسبتاً لطیف و نرم خیالات رکھتا تھا اس کے دل میں عشق و محبت کے جذبات سر اٹھانے لگے تھے۔ وہ انسان سے بطور انسان محبت کرنے لگا تھا بلکہ ایک واقعہ تو ایسا ہے جو نہایت عجیب و غریب ہے۔ جہاں ہم نٹشے کی ایک بالکل دوسری تصویر دیکھتے ہیں ذرا خیال فرمائیے یہ وہ شخص ہے کہ جس کا یہ کہنا تھا کہ کسی پر رحم کھانا کمزوری کی علامت ہے جو یہ کہتا ہے کہ کمزوروں کو اس دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے اور طاقتوروں کو یہ حق ہے کہ وہ ضعیفوں اور کمزوروں کو نیست و نابود کر دیں۔ اسکیمو بھی کرتے ہیں وہ لوگ جو بوڑھے اور ناکارہ ہو جاتے ہیں انھیں وہ برف میں بے یار و مددگار اور تنہا چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ مر جائیں اور اس کا جواز یہ ہے کہ یہ ناکارہ لوگ دولت پیدا کرنے میں کوئی حصہ نہیں لیتے بلکہ دولت صرف کرنے میں حصہ بٹاتے ہیں۔ بظاہر یہ دوسروں پر بوجھ بن کر زندہ رہتے ہیں۔ اس لئے عقل منطقی کا فتویٰ یہی ہے کہ ان کو موت کے حوالے کر دیا جائے (ظاہری سطح پر یہ طریقہ فکر سو فی صد منطقی ہے) مگر نٹشے کے ساتھ آخری عمر میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا اور یہی شخص جو اپنے عہد جوانی میں فلسفۂ طاقت کا علمبردار اور ضعیفوں کو زندہ رہنے کا حق دینے کا روادار نہیں تھا اپنی ضعیفی میں کمزوروں کے حقوق کا محافظ اور ان کے لئے خود اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار نظر آتا ہے اور مزید لطف و حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ معاملہ کسی انسان کا نہیں بلکہ ایک بے زبان جانور کا تھا نٹشے اس جانور تک پر ظلم برداشت نہ کر سکا اور اسے بچانے کی کوشش میں خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے لئے تیار ہو گیا۔

واقعہ یوں ہوا کہ ایک دن نٹشے ایک راستہ سے گذر رہا تھا کہ اس نے ایک گھوڑا گاڑی دیکھی جس پر بے تحاشہ بوجھ لدا ہوا تھا اور وہ گھوڑا بہت

کوشش کر رہا تھا کہ اس کا پاؤں گڑھے سے باہر نکل آئے مگر گاڑی پر لدے ہوئے بہت زیادہ بوجھ کے سبب گھوڑے کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ گاڑی بان کو گھوڑے کی تکلیف کی کوئی پروانہ تھی اس کی تمام تر خواہش تھی کہ جس طرح بھی ہو گھوڑا خود کو گڑھے سے بارہ نکال کر تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگے تاکہ وہ اپنے مال کو اس کی منزل پر پہنچا کر رقوم وصول کر سکے اس مقصد کے تحت وہ گھوڑے کو بے دردی سے مار رہا تھا۔ نٹشے نے دیکھا کہ گھوڑا مار کے خوف سے خود کو گڑھے سے باہر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے مگر گھوڑا گاڑی پر لدا ہوا بوجھ اسے خود کو سنبھالنے سے معذور بنائے ہوئے ہے اس کشمکش میں گھوڑے کو نہ صرف شدید تکلیف ہو رہی ہے بلکہ اس کا پاؤں بھی زخمی اور شکستہ ہو گیا ہے۔ اس عظیم فلسفی سے گھوڑے کی یہ حالت برداشت نہ ہو سکی، اسے گاڑی بان کی سنگدلی پر سخت غصہ آیا اور اس نے اس سے کہا کہ وہ گھوڑے کے ساتھ اس قدر بے رحمانہ سلوک نہ کرے، بلکہ پہلے گاڑی سے بوجھ اتارے تاکہ گھوڑے کو اٹھنے کا موقع مل سکے۔ گاڑی بان اس قدر غصہ میں تھا کہ وہ اس وقت کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے نٹشے کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ نٹشے نے گاڑی بان کو بزور اس تشدد سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس پر گاڑی بان اس قدر مشتعل ہو گیا کہ اس نے خود نٹشے کو تشدد کا نشانہ بنا لیا اور اسے بری طرح زدوکوب کیا۔ نٹشے کو اس حادثہ میں اس قدر چوٹیں آئیں کہ ان کے اثر سے کچھ عرصہ بعد موت سے ہم کنار ہو گیا۔

ایک معمولی جانور کو تشدد سے بچانے کے لئے نٹشے جیسے عظیم فلسفی نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ ہر شخص جو اس داستان کو سنتا ہے متضاد ردعمل کا اظہار کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی ذات تضاد اور تناقص کا شکار ہے۔ ہر انسان باطنی طور پر دو جہات میں بٹا ہوا ہے۔ گویا ہر انسان کی دو داخلی

شخصیتیں ہیں ایک جہت وہ ہے کہ جو نٹشے کے اس عمل کو عشق و اخلاق کے زاویہ سے دیکھتی ہے اور اس کے اس لطیف جذبہ کو سراہتی ہے کہ اس نے ایک جانور کو تشدد سے بچانے کے لئے خود کو ہلاکت میں ڈال لیا اس لئے کہ وہ ایک بے رحمانہ، ظالمانہ اور مجرمانہ فعل کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن انسانی شخصیت کا دوسرا رخ اس واقعہ کو دوسری طرح دیکھتا ہے۔ نٹشے ایک نابغہ روزگار مفکر تھا اس کا ایک جانور کے لئے خود کو قربان کر دینا نہایت غیر منطقی اور احمقانہ فعل نظر آتا ہے۔ کہاں نٹشے اور کہاں ایک معمولی گھوڑا۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ منطق اس بات کو درست تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ بے شک یہ عمل نہ منطقی ہے نہ ضد منطقی بلکہ یہ وہ سطح ہے جو منطق سے ماوراء ہے یہ اخلاق کی سرحد ہے، یہ عشق کی منزل ہے لیکن یاد رکھئے عشق خود غرضی، مفاد یا مصلحت سے بلند و بے نیاز ہوا کرتا ہے۔ اگر انسان اس لئے محبت کرتا ہے کہ اس کے ذریعے اپنی کسی احتیاج کو پورا کرے، اگر وہ کسی کو اس لئے دوست رکھتا ہے کہ وہ بھی اسے دوست رکھے۔ اگر عشق میں خود غرضی یا مفاد پرستی کا عنصر شامل ہے تو پھر یہ عشق نہیں ہے کاروبار ہے، سودے بازی ہے لین دین کا معاملہ ہے عشق کے معنی ہیں ہر چیز کو کسی مقصد کے لئے قربان کرنا اور اس کے عوض کسی شئے کا مطالبہ نہ کرنا، یہ ایک بڑا مشکل مرحلہ ہے، یہ وہ انتخاب عظیم ہے۔ جہاں انسان اپنی ذات کے خلاف انتخاب کرتا ہے۔ یہ وہ منزل ایثار ہے۔ جہاں وہ خود اپنے لئے موت کو منتخب کرتا ہے تاکہ اس کی قربانی کے نتیجہ میں دوسروں کو زندہ رہنے کا موقع فراہم ہو سکے۔ وہ خود مر جاتا ہے تاکہ دوسرے زندہ رہ سکیں اور اگر وہ زندہ رہتا ہے تو اس کی زندگی کا مقصد ایک آئیڈیل کا تحفظ اور تحقیق ہوتا ہے۔

یہ زندان چہارم سے آزادی کا مرحلہ ہے۔ جہاں انسان خود اپنی قربانی

پیش کرتا ہے، یہ مرحلۂ ایثار ہے - ایثار ایک ایسا ---- پر معنی لفظ ہے کہ جس کی مثل دنیا کی کسی زبان میں کوئی اور لفظ موجود نہیں ہے - ایثار وہ منزل ہے، جہاں ایک فرد یعنی انسان خود پر دوسروں کو ترجیح دیتا ہے اپنے اور اپنے سے غیر کے درمیان انتخاب میں اپنے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دیتا ہے اپنے اور اپنے سے غیر کے درمیان انتخاب میں اپنے مقابلہ میں دوسروں کو منتخب کرتا ہے - ایثار کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دے رکاوٹیں ہیں - یہ چار جبر ہیں جو اس پر مسلط ہیں - یہ چار زندان ہیں جو اسے قید یہاں تک کہ خود اپنی زندگی پر دوسروں کی فوقیت کو پوری آگاہی، شعور اور آزادی کے ساتھ قبول کرے - دوسروں کے لئے خود کو قربان کردے - ایثار کا تقاضا یہ ہے کہ اگر انسان کو اپنے اور دوسروں کے درمیان موت کا انتخاب کرنا ہو تو وہ اپنی موت کو منتخب کرے خود اپنی جان ال، نام و نمود، عزت و مقام دولت و آسائش کو قربان کردے، راہ ایثار میں ہر شئے کا نذرانہ پیش کردے اس کے پاس جو کچھ ہے قربان کردے -

زندان چہارم سے جو دیگر تینوں زندانوں کے مقابلہ میں نہایت سخت اور وحشناک ہے، جو داخلی زندان ہے، جو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا ہے اور جس سے علم کے ذریعہ رہائی ممکن نہیں ہے - اس سے آزادی کا وسیلہ قوت عشق ہے یہ وہ قوت ہے جو عقل و منطق سے ماورا ہے جو انسان کو خود اپنی نفی کرنے اور اپنی ذات کے خلاف بغاوت کرنے کی ہمت اور صلاحیت عطا کرتی ہے اور انسان کو انسانیت کے اس مرحلہ میں داخل کرتی ہے، جہاں وہ ذاتی نفع و نقصان کی سطح سے بلند ہو کر کسی اعلیٰ مقصد کے لئے یا دوسروں کے لئے زندہ رہتا ہے - یہ انسان بننے کا بلند ترین مرحلہ ہے اور یہی وہ مرحلہ ہے جب اس انسان کے بدلے جو اپنی ذات کے حصار میں قید ہے - ایک ایسے نئے اور باوقار انسان کا ظہور ہوتا ہے جو آزاد ہے انتخاب کنندہ ہے اور صلاحیت کی تخلیق سے

مالا مال ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی انسانیت خود آگاہی، آزادانہ انتخاب کی قدرت اور تخلیق کی صلاحیت سے عبارت ہے۔ انسان کے انسان بننے کی راہ میں چار بڑی کئے ہوئے ہیں۔ ان چار زندانوں سے رہائی انسان کے انسان بننے کے لئے ضروری شرط ہے۔ ان میں سے تین زندان خارجی ہیں یعنی زندان فطرت، زندان تاریخ اور زندان معاشرہ۔ انسان ان تینوں زندانوں سے خود کو علم کے ذریعہ رہا کر سکتا ہے لیکن چوتھا زندان یعنی زندان ذات داخلی قید خانہ ہے اس سے آزادی علم کے ذریعہ ممکن نہیں ہے بلکہ اس سے آزادی کا ذریعہ وہ قوت عشق ہے جو مذہب کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے۔ ایمان اور عشق کے ذریعہ انسان خود کو زندان ذات سے آزاد کرا سکتا ہے وہ خود غرضی، مصلحت شناسی یا مفاد پرستی کے بدلے قربانی و ایثار کا راستہ اختیار کر کے اپنی انسانیت کو دریافت کر سکتا ہے۔ انسانیت کی تکمیل و ترقی کا راستہ ایثار کا راستہ ہے، یہ عشق کی منزل ہے۔

آخر کلام میں میں رادھا کرشنن کا ایک قول پیش کرنا چاہتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ بحیثیت انسان اس دنیا میں ہماری زندگی کا مقصد اور ہمارا احساس ذمہ داری ہمیں اس بات کی دعوت ہے کہ ہم ایک سازش کو ترتیب دیں، کیسی سازش؟ وہ سازش جس میں انسان، خدا اور عشق مل کر ایک نئے انسان کی تخلیق کر سکیں۔ یہ مسئولیت انسان ہے، ہر انسان کو اس ذمہ داری کو محسوس

ادارۂ احیائے تراثِ اسلامی پاکستان کی مطبوعات

THE FOUNDATION FOR THE REVIVAL OF ISLAMIC HERITAGE

ہاں دوست ایسا ہی تھا
مستقبل کی تاریخ پر ایک نظر
فاطمہؑ، فاطمہؑ ہے
چہار زندانِ انسان
مسلمان عورت اور عہدِ حاضر کے تقاضے
ہنر نجات دہندہ کے انتظار میں
انسان، اسلام اور مغربی مکاتبِ فکر
اسلام اور وقت کے تقاضے
حق و باطل
انسان اور ایمان
تحریفاتِ واقعۂ عاشورہ
جہادِ اکبرؒ
حضرت امام زین العابدینؑ
شیعہ
تفسیر المیزان (تفسیر سورۂ الحمد)
تصبہ
نفسِ مطمئنہ
ذخیرۃ النجات (ائمہ سے منسوب سچے واقعات)
گورباچوف کو دعوتِ اسلام

عرفانیاتِ جوشؒ (جوش کا مذہبی مجموعۂ کلام)
حضرت امام حسنؑ
امام جعفر صادقؑ اور مکتبِ تشیع
امر بالمعروف و نہی عن المنکر
ارکانِ اسلام کی زمانۂ حال میں توجیہات
جنابِ بلالؓ
جنابِ فضہؓ
شریعت پر ایک فکری جائزہ
حیاتِ امام حسینؑ
عقیدۂ توحید اور طبقاتی شعور
معراج المومنین (زائرین و حجاج کے لئے مکمل کتاب)
ارمغانِ نسیم
خطبۂ حضرت فاطمہ زہرا (س)
شہنشاہِ سخن (میر انیس کی رباعیات کا تجزیہ)
گریۂ ذات (مجموعۂ مراثی پروفیسر سردار نقوی)
میر انیس کا تجزیاتی مطالعہ
بوسنیا حکایاتِ خونچکاں
مستقبل کی نسلوں کے نام حضرت علیؑ کا پیغام

اسلام گلگت میں
قرآن کی حفاظت کیوں؟
تاریخ شیعہ
تاریخ اعثم کوفی
توسین (شاعرِ مشرق علامہ اقبال در مدحتِ اہلبیتؑ)
کاروانِ تجلیِ سادات (آگرہ و نواحِ آگرہ کی تاریخ)

زیرِ طبع کتب:
عدلِ الٰہی
جعفری تحفۃ العوام مترجم
قصص الحیوان فی القرآن
حلیفِ رسالتؐ
شہادت
سندھو ویش (منتخب تراجم)
مجموعۂ مقالات (ڈاکٹر علی شریعتی)

Rs. 35

اسٹاکسٹ: فون: ٦٣٦٢٩٢٤
احمد اسٹیشنرز و بک سیلرز، اسٹاکسٹ و جنرل آرڈر سپلائرز
٧/١٨/٢٠۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی